ردائے رحمت

قصیدہ بانت سعاد اور قصیدہ بردہ کی اردو میں شرح و ترجمانی

www.facebook.com/Naat.Research.Centre
www.sabih-rehmani.com/books

مولانا عبداللہ عباس ندوی

ردائے رحمت

قصیدہ بانت سُعاد اور قصیدہ بردہ کی اردو میں
شرح و ترجمانی

www.facebook.com/Naat.Research.Centre
www.sabih-rehmani.com/books

مولانا عبداللہ عباس ندوی

NAAT RESEARCH CENTER
B-50, Sector 11-A, North Karachi, Karachi-75850, Pakistan.

ردائے رحمت

عربی کی دو مشہور و مقبول نعتوں: قصیدہ بانت سعادؓ اور
قصیدہ بُردہ بوصیری کی مکمّل لفظی و معنوی تشریح۔
خلاصۂ مضمون، مکمّل مفہوم، پس منظر، خصوصیات، ادب
اور نحو و بلاغت کے نکتوں کی طرف اشارہ، ان ردیف
وقوافی میں طبع آزمائی کرنے والے عرب شعراء کے کلام
کا نمونہ مع حوالہ جات

شرح و ترجمانی:

مولانا عبداللہ عباس ندوی

شائع کردہ:

مکتبۂ فردوس، مکارم نگر (بُرولیا)، لکھنؤ

جملہ حقوق محفوظ

بار اوّل

سنہ اشاعت:	سنہ ۱۹۸۹ء
ناشر:	مکتبۂ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ
مطبع:	اسکائی لائن پرنٹرس لکھنؤ
تعداد:	۲۰۰۰
قیمت:	۵۵/.. روپئے

باہتمام
ارشاد احمد اعظمی ندوی

ملنے کے پتے:

۱۔ مکتبۂ فردوس، مکارم نگر (بُرولیا) لکھنؤ
۲۔ مکتبۂ 'ذکر و فکر' جی ۱/۲۷۸، اوکھلا، ڈاک خانہ جامعہ نگر، نئی دہلی

تعارف

مؤلف شرح و ترجمہ: عبداللہ عباس ندوی، فاضل ندوۃ العلماء، ایم۔ اے، پی۔ ایچ ڈی (فلسفۂ لسانیات) لیڈز (انگلستان)۔

پیدائش: پھلواری شریف، پٹنہ، ۱۹۲۵ء

موجودہ سکونت و شہریت: مکہ مکرمہ، سعودی عرب

مؤلفات: دروس الاطفال، آسان فقہ، عربی میں تقید کلام (اردو) تعلم لغۃ القرآن الکریم (انگریزی، عربی) قاموس الفاظ القرآن الکریم (عربی، انگریزی) ترجمات معانی القرآن و تطور فہمہ عند الغرب (عربی) مذاہب المنحرفین فی التفسیر (عربی) نظام اللغۃ الادبیۃ (عربی)

سابقہ مشغولیتیں: استاذ ادب دار العلوم ندوۃ العلماء، وکیل ادارہ نشریات شرقیہ سعودی ریڈیو۔ مدیر منظمات اسلامیہ رابطہ عالم اسلامی، اڈیٹر ماہنامہ جرنل مکہ مکرمہ۔ استاذ جامعہ ام القری مکہ مکرمہ، شعبۂ عربی۔

موجودہ مشغولیتیں: معتمد تعلیم ندوۃ العلماء، لکھنؤ
مشیر (اعزازی) رابطۂ عالم اسلامی

ممبر: شریک ادارت، ماہنامہ ذکر و فکر، دہلی
رکن مجلس ادارت، اسلامک کلچر حیدرآباد
رابطۂ ادب اسلامی، تنگوسٹ سوسائٹی کیمبرج، انگلستان۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا
عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

www.facebook.com/Naat.Research.Centre
www.sabih-rehmani.com/books

ھدیہ

اس کمترین کے قلم سے چند کتابیں پہلے بھی مرتب ہو کر شائع ہو چکی ہیں، لیکن کسی کے بارے میں یہ خیال نہیں ہوا کہ ان میں سے کسی کو ــــ کسی کے نام "ہدیہ" کروں یا 'معنون' کرنے کی رسم ادا کروں، جو کام سب کرتے ہوں، ایسے رسومات سے طبعی طور پر کوئی مناسبت نہیں ہے۔

لیکن پیشِ نظر شرح و ترجمانی کی خدمت کے پیچھے ایک خاص جذبہ کارفرما رہا۔ اور وہ ہے اک آرزو کہ مدّاحانِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پائیں میں اذن باریابی مل جائے، یہ آرزو مجھے ورثہ میں ملی ہے، اور اس میں اگر صحتِ نیت اور خلوص کا کوئی حصہ ہے تو وہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد عباس رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کا حاصل ہے۔

اس لیے دعا ہے کہ اس ناچیز کاوش کا صلہ اللہ تعالیٰ میرے والدین مرحومین کو مرحمت فرمائے، یہی دعائے مغفرت اس ناچیز کا ہدیہ ہے۔

روح پدرم شاد کہ او گفت بہ استاد
فرزند مرا عشق بیاموز دگر ہیچ

کمترین ــ بدنام کنندۂ نکونامے چند

عبداللہ

عرضِ ناشر

عربی ادب کی تاریخ میں دو نعتیہ قصیدے 'قصیدۂ بُردہ' کے نام سے بہت مشہور ہوئے، ان میں ایک قصیدہ 'بانت سُعاد' ہے۔ یہ اسلام کی ابتدائی تاریخوں میں کعب بن زہیر بن ابی سلمیٰ کی طرف سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا، آپ نے اسے پسند فرمایا اور شاعر کو انعام کے طور پر اپنی ردائے مبارک عطا فرمائی۔

دوسرا نعتیہ قصیدہ مصر کے مشہور شاعر شرف الدین بوصیری کا ہے۔ یہ تیرہویں صدی عیسوی میں تھے اور ان کے اس قصیدہ کی عمر بھی تقریباً سات سو سال ہے، اس کو بھی قصیدۂ بُردہ کہتے ہیں، اس لیے کہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ اس قصیدہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا اور انعام کے طور پر ان کو اپنی ردائے مبارک عطا کی۔

یہ دونوں مدحیہ قصیدے مسلمانوں کے عربی داں طبقہ اور خود بلادِ عربیہ میں بہت مقبول ہوئے، لوگوں نے ان کی شرحیں لکھیں اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان پر کلام کیا، اور نحو و بلاغت اور فن و ادب کی کسوٹی پر رکھ کر ان کی ادبی اور بلاغی خوبیاں، شاعرانہ بانکپن، اور والہانہ اسلوبِ عشق و محبت کے نکات بیان کیے، بہت سے شاعری کا ذوق رکھنے والے اصحاب نے اسی بحر اور ردیف و قافیہ میں، خود بھی طبع آزمائی کی، اور اس کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ خیال کیا۔

اردو زبان میں بھی ان دونوں قصیدوں کی منثور و منظوم شرحیں لکھی گئیں، اور وہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں، اور شیدائیانِ حُبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شرحوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اپنے جذبۂ عشق و محبت کی تسکین کا سامان فراہم کیا، اور روحانی بالیدگی حاصل کی۔

پیشِ نظر کتاب "ردائے رحمت" بھی اسی سلسلہ کی ایک سنہری کڑی ہے، اور عربی کے ان

دونوں مذکورہ بالا قصیدوں کی اردو زبان میں ایک مبسوط و مفید شرح ہے، اس میں اشعار کا ترجمہ ان کی لفظی اور معنوی تشریح، اور خلاصۂ مضمون پیش کرنے، اور اہل علم و ادب کے لیے ادبی نکات اور نحو و بلاغت کے اہم پہلوؤں کی طرف رہنمائی کرنے کی نہایت بھرپور کوشش کی گئی ہے، نیز کلام کا پس منظر، اس کا مکمل مفہوم اور خصوصیات دلکش پیرایۂ بیان اور عالمانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے، اور ہر طرح کی منطقیانہ اور عامیانہ موشگافیوں سے پرہیز کرکے پوری طاقت کلام کے مفہوم کو سہل اور اس کی ادبی حلاوت کو عام بنانے پر مرکوز کی گئی ہے، تاکہ پڑھنے والے کو کلام کی خوبیوں اور اس کی طاقت و تاثیر کا صحیح طور سے اندازہ ہو سکے، اور وہ اس سے پورا فائدہ حاصل کر سکے۔

اس کتاب کی تالیف و ترتیب عربی اور اردو زبان و ادب کے باکمال ادیب اور مشہور صاحب قلم جناب مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی مدظلہ کے قلم سے ہوئی ہے، وہ اپنے صاف وشفاف طرز تحریر، شگفتہ اسلوب اور پاکیزہ بیانی میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں، وہ اپنے ادبی کمالات کے نتیجہ میں ایک عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادیب اول کے عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں اور ان کے اس دور کے تلامذہ کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے، اور راقم الحروف کو بھی ان کے شاگردوں کی صف میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اس کتاب کی طباعت کی ذمہ داری مکتبۂ فردوس نے قبول کی ہے، بلکہ مکتبہ نے اس سعادت کو حاصل کرنے کی پیشکش خود مصنف مدظلہ سے کی، اور ازراہ شفقت و کرم انھوں نے اس کو قبول فرما کر احسان عظیم فرمایا۔

امید ہے کہ مکتبۂ فردوس کی یہ ادبی اور دینی خدمت اس کی نیک نامی اور شہرت میں اضافہ کرے گی، اور اس کتاب کو قبول عام حاصل ہوگا اور مصنف مدظلہ العالی کو ان کی کاوش ومحنت اور ان کے جذبۂ خلوص کا بہترین صلہ عطا ہوگا اور ان کے حسنات میں مزید اضافہ کا باعث بنے گا۔ ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم،

راقم الحروف
سعید الاعظمی
مدیر البعث الاسلامی

مکتبۂ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ، یوپی
۱۲ صفر ۱۴۱۰ھ / ۱۴ ستمبر ۱۹۸۹ء

عرضِ مؤلف

راقم الحروف نے اپنی تالیف "عربی میں نعتیہ کلام" میں قصیدہ بردہ بوصیریؒ کا تعارف اور نمونہ کے طور پر ۳۶ اشعار نقل کئے تھے، "ذکر و فکر" کے صفحات پر جب ان کو پیش کیا تو متعدد احباب اور صاحب علم و فضل بزرگوں نے ہدایت کی کہ پورے قصیدۂ بردہ کی شرح و ترجمانی اسی انداز میں کردی جائے، میں اس کو فیض ممدوح سمجھتا ہوں کہ میری ژولیدہ بیانی کے باوجود اس حقیر نذرانۂ عقیدت کو قبول عام عطا ہوا، اور ایک طالب علمانہ جسارت سعادت شمار ہوئی۔ اس قصیدہ (۱۶۰ شعر) کی شرح جب مکمل کرچکا تو یہ خیال آیا کہ وہ قصیدہ بردہ جو حضرت کعبؓ بن زہیر بن ابی سلمیٰ نے خود مسجد نبوی کے اندر صحابۂ کرام کی موجودگی میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پیش کیا تھا، اور جس کے ایک شعر پر ان کو ردائے مبارک مرحمت ہوئی، اور جس کو صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین پڑھتے اور سنتے رہے، اور جس کی روایت حد تواتر تک پہونچی ہوئی ہے، اور جو اس عہد پاک کی اجتماعی زندگی کا نمائندہ ہے، اس قصیدہ کی شرح و ترجمانی باعث شرف اور سبب برکت ہوگی۔

"عربی کے نعتیہ کلام" میں اس قصیدہ کا صرف ایک شعر نقل کیا گیا تھا، اس کے علاوہ فنی تجزیہ، مضامین کی تلخیص اور دوسرے بزرگوں نے جو شرحیں لکھی ہیں، یا اس قصیدہ کے وزن و قافیہ پر اظہار عقیدت کیا ہے، اس کی کسی قدر تفصیل تھی، پیش نظر کتاب ان دونوں قصیدوں کی مکمل شرح کا مجموعہ ہے۔ اور قبل اس کے کہ اس کا تعارف اپنی کتاب سے کچھ ترمیم کے ساتھ نقل

کریں چند اہم باتوں کی طرف اپنے قارئین کی نظر مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

۱۔ جیسا کہ چند سطروں بعد آپ اس قصیدہ کے تعارف میں یہ پڑھیں گے کہ اس کا موضوع براہ راست مدح رسالت مآب نہیں ہے بلکہ معذرت نامہ ہے جسے شاعر نے اپنے ہلاک ہونے کے خوف سے اور اپنے آپ کو بچانے کے لئے پیش کیا تھا لیکن ہمیں ان کی نیت اور مقصد سے بحث نہیں، ہم مسلمانوں کے لئے یہ بہت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعر کی توبہ قبول فرمائی، اور اس کے قصیدہ کو سراہا اور ایک شعر پر ردائے مبارک مرحمت فرما کر اس قصیدہ کو عمر جاوداں بخش دی۔ مکمل قصیدہ یا ایک شعر تو بڑی چیز ہے ہم اس نقطہ اور شوشہ کو بھی عقل و فن کی معراج سمجھتے ہیں جس کو وہاں قبولیت حاصل ہو گئی ہو جہاں کی قبولیت کائنات کی تمام نعمتوں سے زیادہ قابل عظمت ہے۔ یہی وجہ ہے دوسری صدی ہجری سے لے کر تیرہویں صدی ہجری تک کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں اس کی شرح و ترجمانی نہیں کی گئی ہو یا اسی وزن اور قافیہ پر دوسرے قصیدے نہ کہے گئے ہوں۔ وہی ایک اونٹنی ہے اور اس کا سراپا، اس کے کوہان و رخسار، جبڑے، تھوتھنے، ٹانگیں، گھٹنے، کھر اور دم ریگستانی صحرا، دھوپ کی تپش، ریگ کے پہاڑ، پانی کی نایابی، اور ان پر قصر شاعر کے مشاہدات۔ یہ سب قابل برداشت ہی نہیں پسندیدہ بن گئے، بلکہ سچ پوچھیے کہ محبوب بن گئے کہ محبوب رب العالمین نے انکو سن کر پسند فرمایا۔

اس قصیدہ کے کچھ ضمنی فوائد اور بھی ہیں جو اپنی جگہ پر اصحاب فکر و نظر کے لئے قابل اہمیت ہوں گے، جن میں اہم یہ ہے کہ قرآن کریم جس عہد و ماحول میں نازل ہوا اس عہد کی یہ تصویر اور ادبی تاریخ ہے، اس ماحول کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم کلام پاک کا مطالعہ کریں گے تو بہت سی معنوی الجھنیں دور ہو سکتی ہیں جن کی طرف میں نے اثنائے کلام اشارہ کیا ہے۔

۲۔ دنیا کے قدیم ترین ادبی سرمائے جمع کرنے اور ان کی ذریعہ ان زمانوں کی اجتماعی و معاشرتی تاریخ مرتب کرنے اور ان پر ریسرچ کرنے کا رواج ہے۔ بعض لوگ اس سلسلہ میں بے سروپا کہانیوں، افسانوں کو اہمیت دیتے ہیں، کچھ لوگ زیر زمین

دفن شدہ ہڈیوں سے تاریخ کا سلسلہ مربوط کرتے ہیں، زمین کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے ٹوٹے گھڑے، پیالے اور ہانڈیاں اعلیٰ درجہ کے بلوری شیشوں کی الماریوں میں سجائی جاتی ہیں کہ یہ ٹکڑا آٹھ سو سال قبل مسیح فلاں نسل کے فلاں محل میں تھا، اور یہ ہاتھی دانت کا پیالہ فرعون مصر کے دسترخوان پر رکھا جاتا تھا، اور یہ ناقابل فہم دقرات، کتبہ سریانی کی ایک شاخ مہرانی زبان کا ہے جو اقنون نامی شاعر نے لکھا تھا اور اس کا مطلب یہ ہے اور وہ ہے حالانکہ یہ تمام باتیں تانوے فی صد ظنی اور تخمینی ہیں۔ "إن هم إلا يخرصون" (یہ سب اٹکل کی باتیں کرتے ہیں) کا مصداق، ان حالات میں ہم ڈیڑھ ہزار برس پہلے کے ایک شاعر کا کلام پیش کر رہے ہیں ـــــ جو تواتر کے ساتھ نقل ہوتا چلا آرہا ہے، جس میں ایک حرف تصنع اور افسانوی دنیا کا نہیں ہے اور جس سے دنیا کے عظیم مذہب اسلام کی ابتدائی تاریخ پر نظر پڑتی ہے۔ کیا وہ اس لائق نہیں کہ خالص علمی بنیاد پر اور تاریخی نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ کیا جائے اور علم و تاریخ کی ٹوٹی ہوئی کڑیاں جوڑی جائیں۔

۳۔ راقم الحروف ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے یہ سمجھتا ہے کہ اہل زبان جب اپنی زبان بولتے لکھتے ہیں تو صرف و نحو اور بیان و بلاغت کے اصول کو پہلے سامنے نہیں رکھتے بلکہ ان کے کلام سے صرف و نحو کے اصول مرتب کئے جاتے ہیں۔ لہذا ہجرت کے سال اول میں ایک اہل زبان نے جو کہہ دیا اس کو چار سو برس بعد کے غیر اہل زبان نحویوں کے اصول پر جانچنا اور ان کے استقراء کو حرف اخیر سمجھنا ایک ایسی فحش غلطی ہے۔ جس نے کلام پاک کو بہت سے لوگوں کے نزدیک ناقابل فہم بنا دیا اور مشکلات القرآن کا فن ایجاد ہو گیا جب کہ یہ بھی ایمان ہے کہ سخن آفریں و بخشندۂ نطق کا یہ کلام ہے اور افصح العرب والعجم پر نازل ہوا اور خالص عرب جن کو اقحاح عرب کہا جاتا ہے وہ اس کو سن کر ایمان لائے، لیکن کسائی اور فراء یا ابن حاجب کے ناقص قیاس اور استقراء کی کمی نے اس کو مشکل بنا دیا اور لطف یہ کہ اسکا اعتراف نہیں کرتے کہ یہ ہمارے فہم کے مشکلات ہیں بلکہ براہ راست مشکلات کی نسبت قرآن کی طرف کرتے ہیں، بہر حال یہ سب بزرگ مجتہد تھے اور سب کی نیت پاک تھی، زیادہ کچھ کہنا بے ادبی ہے، اسی قبیل کی کچھ باتیں اس قصیدہ میں ملیں گی، اور سبعہ معلقہ کے شارحین نے بھی اسی طرح شعراء کی "غلطیوں" کی اصلاح کی ہیں اور "اشکالات" کو حل کرنے میں اپنی قابلیت کا

اظہار کیا ہے۔ صرف مثال کے طور پر اسی قصیدہ کا دوسرا شعر لیجئے :

وَمَا سُعَادُ غَدَاةَ الْبَيْنِ إِذْ رَحَلُوا
إِلَّا أَغَنُّ غَضِيضُ الطَّرْفِ مَكْحُولُ ٭

اعتراض یہ ہے کہ سعاد مؤنث ہے اس کی صفت بھی مؤنث ہونا چاہئے، مگر شاعر نے مذکر باندھا ہے۔ غَنَّاء نہیں اَغَنّ کہا۔ غضیض الطَّرف کہا، حالاں کہ مسماۃ سعاد کو غَضِيضَةُ الطَّرْف کہنا چاہیے تھا، لہذا اس کا حل یہ سوچا گیا کہ ایک آ ہو بیچ میں داخل کیا جائے جو "مشبہ بہ" ہو اور شاعر کی بگڑی ہوئی بات یوں بنائی جائے کہ وماسُعَادُ غَدَاةَ الْبَيْنِ إِذْ رَحَلُوا إِلَّا كَظَبْيٍ أَغَنَّ غَضِيضَ الطَّرْفِ مَكْحُولٍ" یعنی شاعر کے مرنے کے چار سو برس بعد جن عجمیوں نے نحوی قواعد مرتب کیے ان قواعد کے مطابق یہ اشعار نہیں ہیں، لہذا بجائے اس کے کہ قواعد میں ترمیم کی جائے، ان حضرات نے اشعار میں ترمیم ضروری سمجھا اور کم و بیش اسی طرح کے تصرفات کو قرآن کریم کی نحوی و صرفی تفسیر میں روا رکھا گیا ہے۔

بہر حال کوشش کی گئی ہے کہ ایسے مقامات جہاں آئے ہیں ان کی شرح میں نحو و بلاغت کے اصول کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اور صحیح عربی ماحول کی ترجمانی کی جائے وباللہ التوفیق۔

عبداللہ عباس ندوی

٭ سعاد جس صبح سفر کر رہی تھی وہ ایک ہرنی کی طرح تھی جس کی آواز دھیمی اور آنکھیں سرگیں ہیں۔

تعارف

"بردہ" چادر کو کہتے ہیں، اس کا اطلاق ایسے پیراہن پر بھی ہوتا ہے، جو جسم کی ناپ پر نہ تراشا گیا ہو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب ابن زہیر بن ابی سلمٰی کو اس قصیدہ سے خوش ہو کر اپنا پیراہن مبارک مرحمت فرما دیا تھا، اس لئے اسی قصیدہ کا نام ہی "قصیدہ بردہ" پڑ گیا اور "بانت سعاد" مطلع کا ابتدائی لفظ ہے، چوں کہ بوصیریؒ کے قصیدہ پر بھی انھیں خواب میں ایک چادر مرحمت ہوئی تھی، اس لیے ان دونوں قصیدوں میں تمیز کے لئے پہلے کو "قصیدۂ بانت سعاد" اور دوسرے کو "قصیدۂ بردہ" کہتے ہیں۔ اس قصیدہ کے مصنف کعب بن زہیر بن ابی سلمٰی ایک قادر الکلام، پُرگو، اصنافِ سخن پر حاوی، اور خاندانی شاعر تھے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ انھوں نے اپنے ہوش و حواس میں پایا تھا۔ ان کے والد زہیر بن ابی سلمٰی جاہلیت کے نامی گرامی شاعر تھے، ان کا قصیدہ سبعہ معلقہ کا تیسرا قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے :

أَمِنْ أُمِّ أَوْفَى دِمْنَةٌ لَمْ تَكَلَّمِ
بِحَوْمَانَةِ الدَّرَّاجِ فَالْمُتَثَلَّمِ

ان کے بھائی قادر الکلام شاعر تھے، جنھوں نے زہیر کو چند برجستہ اشعار سے مخاطب کیا تھا اور جس کے ذریعہ آگاہ کیا تھا کہ انھوں نے ہجو کہہ کر بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

کعب کے قصیدہ کی تصنیف اور اس کی مقبولیت کا واقعہ یہ ہے کہ کعب اور بُجَیر دو بھائی تھے، اور بلادِ غامد (یمن کے جنوب) کے رہنے والے تھے، یہ دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کر کے اپنے وطن سے چلے، راستے میں ایک مقام "ابرق العزاف"[1] پڑتا تھا، وہاں پہنچ کر کعب کی طبیعت کچھ بدل گئی اس نے اپنے بھائی بُجَیر سے کہا پہلے تم جاؤ

---

[1] یہ ایک کنواں تھا جو بصرہ سے مدینہ منورہ آنے والے کی راہ میں پڑتا تھا، اسی کنویں سے اس مقام کا نام پڑ گیا۔

اور دیکھو مدینہ والے (صلی اللہ علیہ وسلم) کیسے پیغمبر ہیں، وہاں سے آکر اپنی رائے دو تو پھر ہم بھی چلیں گے۔ بُجیر نے اپنا سفر جاری رکھا اور خدمت میں پہنچتے ہی مشرف بہ اسلام ہو گئے، کعب کو اس کی اطلاع ملی تو وہ بہت برہم ہوا اور ایک ایسا قصیدہ کہا جس میں اپنے بھائی کو ملامت کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کا ارتکاب کر بیٹھا اور اپنے بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ایک ایسے دین کو جو خاندانی روایات کے خلاف تعلیم دیتا ہے، جس کو ہمارے آباء و اجداد نے کبھی سنا بھی نہ ہو جس کو اپنے پڑوسی اور اشراف قبائل کی حمایت حاصل نہ ہو تم نے کس طرح قبول کر لیا؟

اشعار اس زمانہ میں آگ کی طرح پھیل جاتے تھے، اور بہت جلد زبان زد ہو جایا کرتے تھے، اس ہجو کی خبر بارگاہِ نبوی ؐ تک پہنچ گئی، محسوس کیا گیا کہ یہ اشعار سخت فتنہ پیدا کرنے اور لوگوں کو دین سے محروم کر دینے کا سبب بنیں گے جو فتنہ پھیلے گا وہ ایک شخص کی ہلاکت سے کہیں زیادہ خطرناک ہو گا، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: "اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ" (فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے) لہذا کعب کے خون کو مباح قرار دیدیا گیا، بُجیر نے بھی اپنے بھائی کعب کو اسی کی ردیف و قافیہ میں چند شعر لکھ کر بھیجے کہ تم جس دین پر ملامت کر رہے ہو، وہی دین حق ہے، ہم نے لات و عزیٰ کا دین چھوڑ کر اللہ کا دین اختیار کیا ہے، جو نجات اخروی اور دنیا میں سلامتی کا یقینی راستہ ہے، بجیر نے اس قصیدہ میں اس کا اشارہ بھی کر دیا کہ کعب نے جو راستہ اختیار کیا ہے، وہ ہلاکت کا ہے، اور عذاب آخرت کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے دنیا میں بھی اس کی سزا پائے گا۔

اس دھمکی کو سن کر کعب گھبرا گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر مدینہ منورہ روانہ ہو گیا، مسلمان اس کی بدزبانی کی خبر سُن چکے تھے، اور اس کے خون کے مباح ہونے کا حال بھی ان کو معلوم تھا وہ سب کی نظروں سے بچتا بچاتا مسجد نبوی ؐ میں پہنچ گیا، اس کے بعد کی روایت یہ ہے کہ مسجد نبوی ؐ میں اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دریافت کیا، لوگوں نے اشارہ سے بتا دیا، خدمتِ گرامی میں حاضر ہوا، اور عرض کیا یا رسول اللہ! کعب اپنے گناہ سے شرمندہ ہے اور توبہ کر کے اسلام میں داخل ہونے کی غرض سے آیا ہے، اگر اس کو خدمتِ عالیہ میں حاضر کر دوں تو آپ معاف فرما دیں گے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

نے فرمایا ہاں، اس نے عرض کیا کہ کعب میں ہی ہوں اور دستِ مبارک میں اپنا ہاتھ دے کر اسلام قبول کیا اور یہ قصیدہ سنایا جس کا مطلع ہے:

بانت سُعَادُ فَقَلْبِي الْيَوْمَ مَتْبُولُ
مُتَيَّمٌ إِثْرَهَا لَمْ يُفْدَ مَكْبُولُ

"سعاد" جدا ہو گئی میرا دل آج مریضِ محبت ہے، اور اس میں ایسا گرفتار ہے جس کے پیروں میں بیڑی ڈال دی گئی ہے، اور اس کو چھڑانے کی خاطر فدیہ بھی نہیں دیا گیا۔

ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں اس قصیدہ کے ۵۱ شعر نقل کیے تھے، ابن ہشام نے اپنی تحقیق سے سات شعروں کا اضافہ کیا[1]

اس قصیدہ کے مضامین حسب ترتیب یہ ہیں:

ابتدائی تیرہ شعروں میں شاعر اپنی ایک فرضی محبوبہ کا ذکر کرتا ہے، جس کا نام اس نے "سعاد" رکھا ہے، ان اشعار میں وہ کہتا ہے کہ "سعاد کی آنکھیں سرگیں ہیں جو حیا و شرم سے نیچی رہتی ہیں، آواز مدھم اور شیریں ہے، جسم متناسب، ناک نقشہ موزوں، دانت ہمیشہ بھیگے بھیگے سے معلوم ہوتے ہیں جیسے اس نے ابھی جام پر جام پیے ہوں، حسن کا پیکر ہے، مگر وعدہ خلاف، بے مروت اور متلون مزاج ہے، اس پر مزید مصیبت یہ کہ وہ اتنی دور چلی گئی ہے کہ اس کے وصال کی تمنا بھی محال ہے، کیوں کہ جہاں وہ ہے، وہاں تک ایک تیز گام اچھی نسل کی اور مضبوط ہڈیوں اور چوڑے چکلے سینے والی اونٹنی ہی پہونچ سکتی ہے چودھویں شعر سے چونتیسویں تک اسی اونٹنی کے اوصاف کا بیان جاہلی کلام کے روایتی انداز پر ہے۔

۳۵ ویں شعر میں شاعر کہتا ہے، یہ اونٹنی ایسی ہے جس کے گرد چغل خور بھاگ دوڑ رہے ہیں، وہ چغل خور جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے بدظن کر دیا ہے اور کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے ہلاک کر دیے جانے کی دھمکی دی ہے، بہرحال موت اگر آنا ہے تو آکر رہے گی، اس سے کون بچا ہے، وہ کون ہے جس کو کسی عورت نے جنم دیا ہو، پھر وہ نعش (مردہ اٹھانے کی چارپائی) پر نہ اٹھایا گیا ہو، ۳۸ ویں شعر تک یہی

[1] لغیتہ الاماثل ج ۱، ص ۴۵۶

مضمون رہتا ہے۔

۳۹ ویں شعر سے ۵۰ ویں شعر تک معذرت کا مضمون ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حلم وعفو کے عادی ہیں، قسم اس ذات کی جس نے آپ کو قرآن کا عطیہ بخشا، وہ قرآن جس میں ہدایت اور احکام شریعت کی تفصیل ہے، میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے، یہ سب لوگوں کا حسد ہے جنھوں نے چغلی کھائی ہے۔

۵۱ واں شعر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کا ہے:

إِنَّ الرَّسُولَ لَنُورٌ يُسْتَضَاءُ بِهِ
وَصَارِمٌ مِنْ سُيُوفِ الْهِنْدِ مَسْلُولُ

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ ایک نور ہیں، جن سے اُجالا اس طرح آنکھوں کے سامنے پھیل جاتا ہے جس طرح نیام سے جب تلوار نکلتی ہے تو ایک چمک سی آنکھوں کے سامنے پیدا ہو جاتی ہے۔

اس شعر کا ترجمہ عام طور سے انہی الفاظ میں کیا جاتا ہے لیکن شعر کا حقیقی مفہوم اس سے ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ کہنا کہ آپ ہندی بے نیام تلوار ہیں یا ایک تیز تلوار ہیں، کوئی معنی نہیں رکھتا، اور نہ اس میں مدح کا پہلو واضح ہوتا ہے، شاعر حضور انورؐ کے چہرۂ مبارک کی نورانیت اور تابناکی کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ تلوار جب میان سے کھینچی جاتی ہے تو اس کی چمک آنکھوں کو ایسی لگتی ہے جیسے تاریکی میں بجلی کی چمک ہو۔ جاہلی عصر کے شعراء روشنی کی تشبیہ آفتاب یا بجلی کی چمک ہی سے دیتے سکتے تھے۔

یہاں تلوار کی چمک سے چہرۂ انور کو تشبیہ دی گئی ہے، جس میں چاندی کی جیسی ایک روشنی ہوتی ہے، اس تشریح کے بعد شعر کا مفہوم یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نور ہیں جن سے اُجالا حاصل کیا جاتا ہے، اور وہ نور ایک مضبوط فولاد کی بے نیام تلوار کے مانند ہے۔

شاعر نے جب یہ شعر پڑھا، حضور صلی نے اپنا پیراہن مبارک اتار کر شاعر کو دے دیا، ۵۲ ویں شعر سے ۵۸ ویں شعر تک صحابہ کرام کی شجاعت، جوانمردی، حق پرستی اور صداقت کی تعریف کی ہے۔

یہ تو قصیدہ کی پیمائش ہوئی، اب ادبی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ

جاہلی ادب کی مکمل نمائندگی اس قصیدے میں موجود ہے۔ محبوبہ کا ذکر، اونٹنی کے اوصاف حسن گریز مقصد (معذرت پیش کرنا) اور مدح پر خاتمہ، الفاظ سہل کم، غریب زیادہ، مثلاً عذافرہ، تبغیل، لہق نعم، مقید، علکوم، شمیل، زھالیل، برطیل عساقیل، مثاکیل، قفعاء وغیرہ، باوجود اس کے قصیدہ میں ایک روانی اور سلاست ہے، خاص طور سے نعت کا جو شعر ہے، وہ بندش اور سلاست دونوں لحاظ سے ممتاز ہے۔

اس قصیدہ کا اصل موضوع تو طلب عفو اور معذرت پیش کرنا ہے، مدح کا مضمون ضمنی ہے، اس لیے آپ دیکھیں گے کہ اس ۵۸ اشعار کے قصیدہ میں نعت کا شعر صرف ایک ہے، جس کو شاہ بیت کہہ لیجیے یا حاصل قصیدہ سمجھیے لیکن یہ ایک شعر جو نعت کا ہے اس کے طالع کی ارجمندی اور بخت کی یاوری پر ہزاروں دیوان اور بیاضیں قربان کہ اس شعر کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا اور اپنا پیراہن مبارک عطا فرما کر شاعر اور شعر دونوں کو عمر جاوید عطا فرمائی، آپ کعب کی ترجمانی اردو میں اس طرح کر سکتے ہیں:

نہ میں اچھا نہ میرے شعر اچھے بات اتنی ہے
جسے اچھا کہیں سرکار اچھا ہو ہی جاتا ہے

(جلیل مانک پوری)

اس قصیدہ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اب تک اس کی بیشمار شرحیں مختلف زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں، عربی کی چند مشہور شرحوں کے نام یہ ہیں:

۱۔	الاسعاد لحل نظم بانت سعاد	از: مسعود بن حسن بکری القنائی
۲۔	بلوغ المراد علی بانت سعاد	": محمد صالح الباعی
۳۔	الجوهر الوقاد فی شرح سعاد	": احمد بن محمد الیمنی
۴۔	شرح بانت سعاد	": ابن ہشام الانصاری
۵۔	حسن السیر لقصیدة کعب بن زہیر	": عطاء اللہ بن احمد الیمنی
۶۔	طریق الرشاد الی تحقیق بانت سعاد	": " "
۷۔	فتح باب الاسعاد فی شرح بانت سعاد	": علی بن سلطان الہروی
۸۔	القول المراد فی شرح بانت سعاد	": محمد حسن المرصفی

۹۔ کنہ المراد فی شرح بانت سعاد   از : جمال الدین السیوطیؒ

غیر عربی شارحین و مترجمین کے کام اس کے علاوہ ہیں، اس قصیدہ پر دوسرے اہلِ ذوق نے جو طبع آزمائی مخمس، مسدس، مسبع کی شکل میں کی ہے، ان کی فہرست بہت طویل ہے، معارضہ (یعنی اسی ردیف وقافیہ میں قصیدہ لکھنے والوں) میں سے چند شعرائے کے نام اور ان کے قصیدوں کے مطلعے سنیے :

۱۔ صاحب قصیدۂ بردہ شیخ محمد بن سعید البوصیری م ۶۹۶ھ :

الیٰ متیٰ أنتَ باللذّاتِ مشغولُ
وأنتَ عن کلِّ ماقدّمتَ مسئولُ

۲۔ الشہید یحییٰ بن یوسف الصرصری العراقی الضریر م ۶۵۶ھ :

رَکْبُ الحِجازِ! ومِنْكَ الخیرُ مأمولُ
هَل عندكَ الیومَ للمشتاقِ تَنْوِیلُ

۳۔ محمد بن العباس الابیوردی م ۵۰۷ھ

خاضَ الدُّجیٰ وَرِوَاقُ اللیلِ مَسْدُولُ
بَرقٌ کما اهتزَّ ماضی الحدِّ مَصْقُولُ

۴۔ ابوالقاسم محمود الزمخشری صاحب تفسیر الکشاف ۵۳۸ھ

أضاءَ لی باللِّوی والقلبُ مَتْبولُ
نجدیّ برقٍ بنارِ الحُبِّ موصولُ

۵۔ عبدالمحسن التنوخی الحلبی م ۶۴۳ھ

صَبٌّ علیلٌ وَمابالرَّبعِ تعلیلُ
فلیس إلّا علی الأعوالِ تَعْوِیلُ

۶۔ الشہاب، احمد بن عبدالملک المعروف بالفزازی (سن وفات معلوم نہیں ساتویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں)۔

؎ کشف الظنون، دوم ج

دُمیٰ باطلالِ ذاتِ الخالِ مَطْلُولُ
وَجَیشُ صبری مَهزومٌ ومَفلولُ

۷۔ اثیر الدین ابو حیان الاندلسی م ۶۹۲ھ

لا تَعْذُلاه فما ذو الحبِّ مَعذولُ
العقلُ مُختَبَلٌ والقلبُ مَتبولُ

۸۔ ابن سید الناس البصری الشافعی م ۷۳۴ھ

قَلبی بِکُم یا أهلَ الحیِّ مأهولُ
وَحَبلُه بامانی الوصلِ موصولُ

۹۔ نورالدین الہمدانی م ۷۳۹ھ

سَلمیٰ سلمتِ فَفِیكِ الصَّبُّ مَقتولُ
والعذرُ منكِ شبیهُ العذرِ مقبولُ

۱۰۔ جمال الدین ابن نباتہ المصری م ۷۶۸ھ

ماالطرفُ بعدکم بالنّومِ مکحولُ
هذا وکم بیننا من رَبعِکُم میلُ

۱۱۔ ابن جابر الاندلسی م ۷۸۰ھ

بانت سُعادُ فعقدُ الصبرِ محلولُ
والدمعُ فی صفحاتِ الخدِّ مَبذولُ

۱۲۔ برہان الدین القیراطی م ۷۸۱ھ

جُرحُ الجفونِ بقذفِ الدمعِ تعدیلُ
والحبُّ شاهدُهُ المجروحُ مقبولُ

۱۳۔ عبدالرحمن بن علی الحنفی الزمزمی المعروف بابن الصائغ م ۷۸۶ھ

دعْ قلبَه فهو مشغوفٌ ومشغولُ
ودمعَه فهو مطلوبٌ ومطلولُ

۱۴۔ عزالدین الموصلی م ۷۸۹ھ

هَل يُبْرِی الصَّبَّ قَبْلَ الموتِ تَقبِیلُ

فَقَلبُہ بِکُؤُوسِ الشَّوقِ مَعْلُولُ

۱۵ ۔ علاء الدین الدمشقی، آٹھویں صدی ہجری کے ایک بزرگ ہیں، انھوں نے اپنے قصیدہ کا نام " شمس المطالع فی مدح القمر الطالع " رکھا ہے، جو حلبی کے مطبع مصر ۱۲۹۶ھ میں شائع ہوچکا ہے:

مَصُونٌ وَمَعِی علی الخدّین مَبذولُ

وفیکُمُ انا معذورٌ ومَعذُولُ

۱۶۔ محی الدین ابوطاہر محمد بن یعقوب الفیروز آبادی صاحب القاموس (قصیدہ کا نام " زاد المعاد فی معارضة بانت سعاد ")

هَل حَبلُ عزّةَ بعدَ البَینِ مَوصُولُ

اَو بارقُ الوَصلِ بَینَ البَینِ مأمولُ

۱۷۔ اسماعیل بن محمد القلقشندی م ۸۲۱ھ

سَیفُ العیونِ علی العُشّاقِ مَسلولُ

وَصارِمُ اللّحظِ مَسنونٌ ومَصقولُ

۱۸ ۔ شمس النواجی م ۸۵۹ھ

قَلبٌ علی الحُبِّ والاَشواقِ مَجبولُ

هَیهَاتَ یَنفَعُ فیہ القالُ والقِیلُ

۱۹۔ قاضی بہاء الدین محمد الباعونی الشامی (نویں صدی ہجری)

نَوحِی وَقَرّاحُ التَّسهیدِ مَعسُولُ

فکیفَ یَحصُلُ لی مِن طَیفِکُم سُولُ[1]

۲۰ ۔ علاء الدین بن ملیک الحلبی م ۹۱۷ھ

لأی العقیق فاجری دمعہ لؤلؤ

مُتَیَّمٌ دَمعُہُ بالہَجرِ مَطلُولُ

---

۱ مخفف "سُؤْل" جمع سوال

۲۱ ۔ عبدالغنی النابلسی صاحب " تعطیر الانام فی تاویل المنام م ۱۱۴۳ھ (نفحة القبول فی مدح الرسول) :

هَل فی البُروقِ عن الاحبابِ تَعلیلُ

لا وَالّذی وَمالَہ فی الحُکمِ تَعلیلُ

۲۲ ۔ یوسف بن اسماعیل النبہانی :

هَوایَ طَیبةُ لا بیضاءُ عُطبُولُ

وَمُنیَتی عَینُها الزَّرقاءُ لا النِّیلُ

فارسی اور اردو میں بھی بہت سی شرحیں اور ترجمے کئے گئے ہیں جن میں زیادہ مشہور شیخ احمد بن شمس الدین دولت آبادی کی عربی و فارسی شرح ہے، اس کے بعد حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی متوفی ۱۲۴۵ھ کی شرح فارسی اور عربی کے علاوہ منظوم اردو میں ہے۔ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کی شرح عربی و اردو میں ۱۳۱۷ھ میں شائع ہوئی ہے۔

قصیدۂ بانت سعاد کی مقبولیت کا راز، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، صرف اس بات میں ہے کہ یہ وہاں مقبول ہوگیا تھا، جہاں کی سندِ قبولیت کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہیں رہ جاتی قاضی محی الدین بن عبدالظاہر نے اپنے معارضہ (طرحی قصیدہ) کے آخر میں یہ دو شعر لکھے ہیں جو یقیناً اس قبیل کے ہر شاعر کے دل کی ترجمانی ہے:

قَد قالَ کَعبٌ فی النّبی قَصیدةً

وَقُلنا، عسیٰ فی مَدحِہ نَتَشارَکُ

فَإن شَمِلَتنا بالجَوائزِ رَحمةٌ

کَرَحمةِ کَعبٍ فَهوَ کَعبٌ مُبارَکُ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کعب نے ایک قصیدہ کہا اور میں نے کہا تاکہ ان کی مدح میں ہم سب شریک ہوجائیں۔ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رأفت ورحمت سے ہمیں بھی اپنے انعامات سے نواز دیا جیسا کہ کعب پر رحم فرمایا گیا تھا۔ تو میرا قدم

---

۱ المجموعة النبہانیة میں یہ تمام قصائد مکمل موجود ہیں۔

بڑا مبارک ہوگا۔[1]

شیخ شمس الدین النواجی م ۸۵۹ھ نے "بانت سعاد" کے وزن پر جو قصیدہ کہا ہے اس کے اخیر میں کہتے ہیں :

۱ كَعْبٌ لَهُ فِي مَدِيحِ الْمُصْطَفٰى قَدَمٌ
سَبَّاقَةٌ وَبِخَيْرِ الْخَلْقِ تَفْضِيلُ

۲ وَرَوْضَةٌ ابْنُ زُهَيْرٍ طَابَ مَغْرِسُهَا
فَزَهَا بِنَدَى كَفَّيْهِ مَطْلُولُ

۳ وَإِنْ نَسَجْتُ عَلٰى مِنْوَالِ بُرْدَتِهِ
طِرَازَ مَدْحٍ، لَهُ بِالدُّرِّ تَكْلِيلُ

۴ فَإِنَّهُ كَانَ مِفْتَاحًا لِبَابِ هُدًى
لِنَابِهٖ فِي دِيَارِ الْخُلْدِ تَأْهِيلُ

۵ إِنْ لَمْ أَفُزْ بِقَبُولٍ فِي مَتَابِعَتِي
بَانَتْ سُعَادُ فَقَلْبِي الْيَوْمَ مَتْبُولٌ[2]

۱۔ نعتِ مصطفٰے (صلی اللہ علیہ وسلم) میں کعب کا قدم بہت آگے ہے، اور خیر خلق صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی فضیلت ثابت ہے۔

۲۔ ابن زہیر کے لگائے ہوئے باغ کی زمین بڑی مبارک ہے۔ اس کو اور بھی پُربہار ان مبارک ہاتھوں کی سخاوت نے کر دیا، جس کی شبنم سے وہ سینچا گیا۔

۳۔ اگر میں نے ان کی (کعب کی) "چادر" کے انداز پر مدح کی ایک چادر بنی جس کی گوٹ موتیوں سے مزین ہیں۔

---

[1] کعب کے لفظی معنی ٹخنہ کے ہیں۔ مجازاً قدم اٹھانے (یعنی) فعل کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں، جیسے اردو میں کسی کام کے لئے قدم اٹھانا بولتے ہیں۔

[2] المطابع الشمسیہ دیوان الشمس النواجی قلمی کتب خانہ حرم۔ مکہ ادب ۱۸۸۱

۴۔ تو اس لیے کہ وہ باب ہدایت کی کنجی ہے، جس سے جنت کی منزل میں رہنے کا دروازہ کھلے گا۔

۵۔ اور اگر (خدا نخواستہ) اس پیروی میں قبولیت سے سرفراز نہیں کیا گیا تو "سعاد" جُدا ہوگئی اور میرا دل آج زخمی ہے۔

ڈاکٹر زکی مبارک لکھتے ہیں :

"کعب بن زہیر کا قصیدہ صوفیہ اور مشائخ کے حلقوں میں کافی مقبول ہے، میں نے سُنا ہے کہ اسکندریہ کے ایک صوفی بزرگ جن کا حلقہ بہت وسیع ہے، اپنی مجالس کا افتتاح ہمیشہ اس قصیدہ سے کرتے ہیں۔ ان سے جب اس کا سبب دریافت کیا گیا تو کہا کہ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کعب کے قصیدہ کی کیا حقیقت ہے؟ ــــ تو ارشاد ہوا کہ میں اس کو اور اس کے پسند کرنے والوں کو عزیز رکھتا ہوں۔ چنانچہ اس روز سے میرا معمول ہے کہ ایک بار دن رات میں اس کو پڑھ لیتا ہوں[1]"

---

[1] المدائح النبویہ فی ادب العربی ص ۸۵۔

www.facebook.com/Naat.Research.Centre
www.sabih-rehmani.com/books

شرح و ترجمہ قصیدۂ بانت سعاد

بَانَتْ سُعَادُ فَقَلْبِي الْيَوْمَ مَتْبُولُ* مُتَيَّمٌ إِثْرَهَا، لَمْ يُفْدَ، مَكْبُولُ

میرا دل بے چین ہے، آج سعاد داغ مفارقت دے گئی، اور میں اس کے پیچھے ایسا محبت کا غلام ہوں جس کے پیر میں بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں اور جس کی رہائی کے لیے کوئی فدیہ نہیں دیا گیا ہے۔

اس شعر میں مَتْبُول کا لفظ آیا ہے جس کے معنی مریض کے ہیں، عام مریض نہیں بلکہ وجدان وتصورات کے لحاظ سے جو بیمار ہو، اسی لیے لوگوں نے مریض محبت کے لفظ سے اس کا ترجمہ کیا ہے' میں نے اس کا ترجمہ بے چین کیا ہے جو مرض کی حالت میں بے قراری کی طرف اشارہ کرتا ہے، دوسرا لفظ مُتَيَّم کا ہے، جس کا ترجمہ غلام محبت کیا جا سکتا ہے کیونکہ تَيَّمَهُ الْحُبُّ۔ کا مطلب اِسْتَعْبَدَهُ ہے، لَمْ يُفْدَ فدیہ نہیں ادا کیا گیا، اس دور کا عدالتی نظام یہ تھا کہ جرم کی پاداش میں مجرم کو جسمانی آزار پہونچایا جاتا یا جرمانے کر چھوڑ دیا جاتا تھا، جرمانہ کی مقرر رقم ادا کر کے آزاد کرانے کو فدیہ دینا کہتے ہیں، موجودہ زمانہ میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ قیدی جس کی ضمانت نہیں قبول ہوئی۔ مگر پھر بھی مفہوم ناقص رہے گا، کیونکہ ضمانت دیکر مجرم عارضی طور پر قید سے آزاد ہوتا ہے اور مستقبل میں دوبارہ قید ہونے کا خطرہ رہتا ہے، لیکن فدیہ سے مجرم آزاد ہو جاتا ہے، صرف سمجھنے کے لیے اگر عربی ماحول کا شعر اپنے ماحول پر منطبق کرنے کے لیے آپ اس کا ترجمہ یوں کر سکتے ہیں کہ سعاد دور چلی گئی، میرا دل مضطرب ہے اور خود میرا وجود ایک ایسے قیدی

* بعض نسخوں میں مبتول مذکور ہے یعنی منقطع

کے جیسا ہے جس کی ضمانت نہ ہو رہی ہو اور پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوں، اردو شعراء محبت کو جنون کہتے ہیں اور پاگل کے لیے زنجیر تجویز کرتے ہیں کسی نے محبوب کے گیسو کو زنجیر قرار دیا ہے اور کسی نے محبت کو محبت کو قید اور اس کے اثرات کو پاؤں کی زنجیر یا بیڑی کہنا ایک روایتی اشاریہ ہے جو عربی کی ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی شاعری میں بھی ملتا ہے اور موجودہ عصر کی شاعری میں بھی۔

حضرت کعب بن زہیر کے نعتیہ قصیدہ کا یہ پہلا شعر ہے جو تشبیب کے روایتی انداز سے شروع ہو رہا ہے،

وَمَا سُعَادُ غَدَاةَ الْبَيْنِ إِذْ رَحَلُوا إِلَّا أُغَنُّ غَضِيضُ الطَّرْفِ مَكْحُولُ

جب صبح کو قافلہ روانہ ہو رہا تھا، جس قافلہ میں سعاد بھی تھی اس وقت اس کی دھیمی نسوانی آواز، سرگیں آنکھیں، نیچی نگاہیں (آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہیں۔)

أَغَنّ اس شخص کو کہتے ہیں جو ناک سے بولے(۱)، اسی سے غُنّہ کا لفظ نکلا ہے، عام طور پر تکبر اور ناز سے بولنے میں یہ آواز نکلتی ہے، اردو میں اس کا کوئی تصور نہیں ملتا، اس لیے اس کا ترجمہ دھیمی نسوانی آواز کر دیا ہے، ترجمہ میں یہ جملہ "آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہیں" حرف إذ کا مفہوم ہے جو عربی میں جملہ کو مکمل کر رہا ہے۔ قرآن شریف کے ترجمے میں جہاں حرف إذ آتا ہے جیسے (إذ قال ابراهيم) یا (إذ قال آدم) اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ یاد کرو وہ وقت کہ جب....' یہ إذ ظرفیہ ہے۔

اس شعر میں قابل لحاظ بات، غَدَاةَ الْبَيْنِ ہے صبح فراق، اردو فارسی میں شام فراق یا شب فراق بولا جاتا ہے، عربی میں صبح فراق کے کہنے کا سبب یہ ہے کہ سفر پر قافلے جب نکلتے تھے تو صبح سویرے کوچ کیا کرتے تھے، رات کو سفر شروع کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا، ناہموار کچے پتھریلے راستے، کہیں ٹیلے اور پہاڑ، کہیں نشیب اور کہیں کھائی، لٹیروں کا ڈر اور حملہ آوروں کا خوف ہر قدم پر رہتا تھا اس لیے سفر عموماً قافلہ کے ساتھ ہوتا اور دن کی روشنی میں طے کیا جاتا، اس شعر سے عرب ماحول اور ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی بدویانہ زندگی اور قبائلی رواج کا منظر سامنے آتا ہے۔

عربی داں حضرات کے لیے اس شعر کی ترکیب سمجھنے میں ایک الجھن ہو سکتی ہے کہ أغن ناک سے بولنے والے کو کہتے ہیں، مؤنث کے لیے غَنَّاءُ، غَضِيض اور مکحول دونوں مذکر کے لیے

(۱) وہ آواز جو خیاشیم Nasal Cavity سے نکلتی ہے۔

ہیں اور یہاں (صفت) مؤنث (اسعاد) کی ہے، لہٰذا ما اور إلا کا ترجمہ کرکے وہ اس الجھن کو دور کرسکتے ہیں کہ سعاد کیا ہے؟ ایک نرم آواز اور نیچی اور سرمگیں نگاہ کا نام ہے، یعنی اس کا سراپا ان علامتوں سے سامنے آتا ہے، الباجوریؒ اور ابن ہشام الانصاریؒ نے مشبہ "بہ ظبی" قرار دیا ہے جو محذوف ہے مگر ہرنی سے تشبیہ دینا شرح کرنے والوں کے زمانے کی بات ہے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نحو کے قواعد کو اہل زبان پر مسلط کرنا صحیح نہیں ہے، آہو یا غزال کی آنکھیں اور چال تو تشبیہ کے لیے مستعمل ہیں مگر اس کی آواز اور ناک سے بولنے کی ادا سے کوئی تشبیہ نہیں دی جاتی، لہٰذا اس تاویل کی ایک بڑی غلطی تو یہی ہے، دوسرے اہل زبان تذکیر و تانیث کا استعمال اپنے انداز میں کرتے ہیں۔ نحویوں کو یہ حق نہیں ہے کہ اہل زبان کے کلام پر حرف گیری کریں، ان کا کام صرف اتنا ہے کہ اہل زبان جو بولیں جس طرح بولیں ان سے ایک ڈھیلا ڈھالا قاعدہ بنالیں جس میں لچک ہونی چاہیے۔

هَيْفَاءُ مُقْبِلَةً عَجْزَاءُ مُدْبِرَةً لَا يُشْتَكَى قِصَرٌ مِنْهَا وَلَا طُولُ

جب سامنے ہوتی ہے تو چھریرے بدن کی معلوم ہوتی ہے جب پیچھے مڑتی ہے تو بھاری بھرکم (گداز جسم) کی نظر آتی ہے، اس کا قد ایسا ہے جس میں نہ پستہ قد ہونے کی شکایت کی جاسکتی ہے نہ دراز قد ہونے کی۔

تَجْلُو عَوَارِضَ ذِي ظَلْمٍ إِذَا ابْتَسَمَتْ كَأَنَّهُ مُنْهَلٌ بِالرَّاحِ مَعْلُولُ

جب وہ مسکراتی ہے تو لعاب دہن سے تر دانت چمک اٹھتے ہیں جیسے اسی راہ سے پہلا جام شراب اور دوسرا جام شراب گذرا ہے۔

اس شعر کو سمجھنے کے لیے یہ پس منظر ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس دور کے ریگستانی عرب میں پانی ایک بیش بہا نعمت تھی، سبزہ اور نمی ایک متاع بے بہا تھی، پیاس سے عام طور پر گلے خشک زبان سوکھی رہتی تھی اور لب و دنداں میں کوئی نمی نظر نہیں آتی تھی، لہٰذا ایسے لب و دنداں جنہیں تازگی محسوس ہو اور خشک اور سوکھے ہوئے نظر نہ آئیں، حسن کی علامت تھی، (یوں بھی سوکھے ہوئے ہونٹ اور خشک دانت کبھی بھی اچھے نہیں لگتے اور بیماری کی علامت سمجھے جاتے ہیں) عربی میں ظَلْم لعاب دہن کو کہتے ہیں، بعض شارحین نے بَرِیْق یعنی چمک کے معنی لیے ہیں۔

کمسن کے دانت چمکتے ہوتے ہیں، لہٰذا وہ کہنا چاہتا ہے کہ سعاد کمسن ہے، اس کے دانت چمکیلے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ آگے کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس کے دانت جو مسکراہٹ کے وقت نظر آتے ہیں وہ سوکھے ہوئے نہیں بلکہ بھیگے ہوئے ہیں، پھر یہ بتاتا ہے کہ کیسے بھیگے ہوئے؟ اس کو دوسرے مصرعہ میں واضح کرتا ہے کہ گویا اس نے جام شراب نوش کیا ہے، جس کی نمی باقی تھی کہ اس نے دوسرا جام بھی پی لیا۔ منهل اسم ظرف ہے نهل کا، جام اولین کو نهل اور دوسرے کو علل کہتے ہیں، سننے میں یہ ترجمہ کچھ عجیب سا معلوم ہوگا مگر شاعر نے کہا یہی ہے کہ محبوب کے دنداں جام اول اور جام ثانی کے گذرگاہ ہیں اور مفہوم یہ ہے کہ ان میں تازگی اور نمی ہے، آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے دانت شراب سے تر کیے ہوئے ہیں، اور لب و دنداں کی حکایت کوئی نئی نہیں ہے، اردو فارسی کے شعراء نے بکثرت یہ مضمون باندھا ہے۔ عرب شاعر نے صرف نئی بات یہ کہی ہے کہ ان میں شادابی اور نمی ہے اور پھر نمی کی تشریح کی ہے کہ کس طرح کی نمی؟

شُجَّتْ بِذِي شَبَمٍ مِنْ مَاءِ مَحْنِيَةٍ صَافٍ بِأَبْطَحَ أَضْحَى وَهُوَ مَشْمُولُ

تَنْفِي الرِّيَاحُ الْقَذَى عَنْهُ وَأَفْرَطَهُ مِنْ صَوْبِ سَارِيَةٍ بِيضٌ يَعَالِيلُ

محبوب کے دنداں ایسی شراب سے تر ہیں جس میں ٹھنڈا اور صاف و شفاف پانی ملا ہوا ہے۔ خالص شراب کو صِرف کہتے ہیں، جب اس میں پانی ملا دیتے ہیں تو خمرہ ہو جاتا ہے، شاعر کہنا چاہتا ہے کہ سعاد نے جو شراب پی ہے وہ پانی ملی ہوئی ہے۔ اگر خالص شراب پیتی تو وہ مختصر ایک دو گھونٹ ہوتی، مگر اس نے تو جام پر جام چڑھائے ہیں وہ بھی پانی ملا کر جب ہی تو اس کے دانتوں میں ذرا خشکی نہیں ہے اور جو پانی ملایا ہے وہ معمولی کنوئیں کا پانی نہیں ہے بلکہ وہ پانی ہے جو آسمان سے گرنے والے اولوں سے پگھل کر بنا ہے اور وہ پانی جو بہہ کر وادی کے موڑ پر بلندی سے گرا ہو اور سطح پر آکر صاف و شفاف نظر آتا ہو اور شمال کی جانب سے چلنے والی ہوا اس کو سرد رکھتی ہو۔

ہوائیں اس پانی سے گرد و خاشاک کو دور کرتی ہیں اور اس صفائی اور ٹھنڈک کو اس بارش کا پانی اور بڑھا دیتا ہے جو رات کو اٹھنے والے بادل سے برستا ہے اور مسلسل پانی بہانے

والے پہاڑ اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

شَبَمٌ اولہ (آسمان سے گرنے والی برف) مَحْنِيَة موڑ، مَشْمُول جس کو شمالی ہوا لگی ہو۔ صَوْبٌ بارش، بیض یعالیل پہاڑ۔

ان دونوں شعروں میں شاعر اس پانی کا ذکر کر رہا ہے جو شراب میں ملا کر اس کی محبوبہ نے پیا تو اس کے دانت شگفتہ اور تر رہنے لگے، پانی کی قلت اس عہد کی زندگی کا لازمہ تھا، قرآن کے مخاطبین اولین کو جنت کی جن نعمتوں کا تصور دیا گیا ہے اس میں ٹھنڈے پانی کا بھرے بھرے گلاسوں کا، زیر قدم بہتی ہوئی نہروں کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے (ظِل ممدود وماءٌ مسکوب۔) ان اشعار میں بھی عرب معاشرت کا یہی پہلو نظر آرہا ہے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے عربی اشعار سے مدد لی جائے تو اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ کے صحیح مفہوم کو عربی کے اشعار سے سمجھا جائے اور ان کو مثال کے طور پر پیش کیا جائے بلکہ اس کے ساتھ ماحول کو بھی سمجھا جائے جس میں قرآن نازل ہوا تھا، مثلاً یہی دیکھیے کہ پانی کیسی متاع نایاب تھی کہ شاعر اس کی مختلف قسموں کو بیان کر رہا ہے۔ اولے کا پانی پہاڑ سے گرا ہوا اور وادی کی طرف بہتا ہوا پانی، سطح زمین پر ٹھہرا ہوا پانی، جو بادل رات کو اٹھتے ہیں، ان کا پانی اور ایسا پانی جن کو شمال سے چلنے والی ہوا نے ٹھنڈا کر دیا ہو۔ اور تیز ہواؤں نے سطح آب سے خس وخاشاک دور کر دیے ہوں۔ شاعر کی تلاش اس کے مشاہدات کی پابند ہوتی ہے، اس کے مشاہدات اور فکر کی بلند پروازی اس کی وادی تک محدود تھی، اور قرآن کے یہی اولین مخاطب تھے جن کے ذریعہ مشیت نے ساری دنیا کو پیغام ہدایت پہونچانا طے کر دیا تھا، جو بدو اپنے اونٹوں کے ریوڑ، بھیڑوں کے گلے، تانت کے خیمے اور گدلے پانی کو دنیا ومافیہا کی نعمت سمجھتے تھے ان سے نیل، فرات ودجلہ کے کنارے بسنے والے اور سیکڑوں برس کی تمدن یافتہ اقوام کو صحیح راستے پر لگایا گیا یہ خود اپنی جگہ پر اسلام کا اہم معجزہ ہے۔

أكرِمْ بِهَا خُلَّةً لَوْ أَنَّهَا صَدَقَتْ ... مَوْعُودَهَا أَوْ لَوَ انَّ النُّصْحَ مَقْبُولُ

لَكِنَّهَا خُلَّةٌ قَدْ سِيطَ مِنْ دَمِهَا ... فَجْعٌ وَوَلْعٌ وَإِخْلَافٌ وَتَبْدِيلُ

اس کی دوستی کتنی قابل عظمت ہوتی یا وہ کس درجہ اچھی دوست ہوتی، کاش وہ اپنے

وعدے کی سچی ہوتی اور بات ماننے والی ہوتی، لیکن وہ تو ایسی دوست ہے کہ اس کی رگ وپے میں دکھ پہونچانا اشتیاق بڑھانا، وعدہ خلافی کرنا اور مکر جانا سرایت کیے ہوئے ہے۔

خِلَّة (خ کو زیر) دوستی، خُلَّة (خ کو پیش) دوست

فَمَا تَدُومُ عَلَى حَالٍ تَكُونُ بِهَا ... كَمَا تَلَوَّنُ فِي أَثْوَابِهَا الْغُولُ

وَلَا تَمَسَّكُ بِالْوَعْدِ الَّذِي زَعَمَتْ ... إِلَّا كَمَا تُمْسِكُ الْمَاءَ الْغَرَابِيلُ

کسی حال پر اس کو قرار نہیں، اور ہر آن اس طرح رنگ بدلتی ہے جیسے بھوت پریت اپنے پیراہن اور شکلیں بدلتے ہیں اور وعدہ کا اس کے یہاں کوئی پاس نہیں ہے اور جو وعدہ کرتی ہے وہ اتنی ہی دیر قائم رہتا ہے جتنی دیر چھلنی میں پانی۔

فَلَا يَغُرَّنْكَ مَا مَنَّتْ وَمَا وَعَدَتْ ... إِنَّ الْأَمَانِيَّ وَالْأَحْلَامَ تَضْلِيلُ

كَانَتْ مَوَاعِيدُ عُرْقُوبٍ لَهَا مَثَلًا ... وَمَا مَوَاعِيدُهَا إِلَّا الْأَبَاطِيلُ

أَرْجُو وَآمُلُ أَنْ تَدْنُو مَوَدَّتُهَا ... وَمَا إِخَالُ لَدَيْنَا مِنْكِ تَنْوِيلُ

جو تمنا وہ دل میں پیدا کرے یا امیدیں دلائے یا وعدہ کرے اس سے دھوکہ نہ کھانا، جھوٹی امیدیں دلانا اور خواب وخیال کی باتیں بنانا بے راہ روی ہے، اس کے وعدوں پر عرقوب کی مثال صادق آتی ہے، اور اس کے وعدے ہمیشہ لغو اور باطل ہوتے ہیں، (مگر پھر بھی) چاہتا ہی ہوں امید یہی ہے کہ اس کی چاہت بڑھے، مگر اے سعاد! میں نہیں سمجھتا کہ تمہاری طرف سے مجھے محبت کا جواب ملے گا۔

عرقوب ایک افسانوی شہزادہ تھا جو ہمیشہ وعدہ کر کے مکر کر جاتا تھا۔

اوپر کے سات شعر عشق وعاشقی کی ازلی روایت کو دہرا رہے ہیں، مشرقی ادب میں محبوب کا تصور یہ ہے کہ صورت وسراپا کے لحاظ سے دنیا میں اس کی مثال نہیں ہے لیکن سیرت اتنی بری کہ خدا کی پناہ، سر سے پیر تک ظلم وقہر کی تصویر، جھوٹ، مکر، وعدہ خلافی، ظلم، بے رحمی اس کی نمایاں خصوصیات ہیں، ایک طرف آنکھیں سرمگیں ہیں، رسیلی ہیں، کٹیلی ہیں نرگس اور غزال کی آنکھوں کے مانند ہیں مگر دوسری طرف انمیں مروت نہیں، طوطا چشمی ان کی خصلت ہے۔ نیز یہ کہ عاشق کو گھائل کرتی ہیں، پلکوں سے تیر کا کام لیتی ہیں وغیرہ وغیرہ، غرض ہماری روایتی شاعری میں دو ہزار برس سے یہ روایت دہرائی جا رہی ہے کہ عاشق کے لیے سیرت کی تمام خوبیاں

اور محبوب کیلئے ظاہر کی تمام رعنائیاں تشبیب کے ان اشعار میں آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ شاعر اپنی فرضی محبوبہ سعاد کے لب دنداں، آواز اور سراپا کی خوبیاں بتانے کے بعد اس کی سیرت کی برائیاں بیان کرنا شروع کر دیں کہ وہ خیر خواہی کی بات نہیں سنتی، جھوٹی ہے مکار ہے، ہر آن رنگ بدلتی ہے، اس میں کبھی بھوت پریت بلکہ اس سے بڑھ کر چڑیل کی صفات ہیں (غول شیطان کی مادہ کو کہتے ہیں) یہ بات ہمارے فارسی اردو میں بکثرت ملتی ہے اور اتنی عام ہے کہ اس کی مثال دینے کی ضرورت نہیں

عربی داں حضرات کے لیے یہ بات باعث انتباہ ہوگی کہ ان سات شعروں میں چھ شعر بلکہ ساتویں شعر کے پہلے مصرع تک محبوب کو صیغۂ غائب (3rd form) میں ذکر کیا ہے اور اچانک بغیر کسی ادنی ترمیم و تمہید کے کہتا ہے وما إخالُ لَدَينا مِنْكِ تَنْوِيلُ ، مگر اے سعاد! میں نہیں سمجھتا کہ تمھاری طرف سے محبت کا کوئی جواب ملے گا، یہ عربی کا عام اسلوب ہے، اس کو اصطلاح میں التفات کہتے ہیں، غائب سے حاضر اور حاضر سے غائب کی طرف التفات کرنا، سورۂ فاتحہ میں الحمد سے لے کر یوم الدین تک حمد و اعتراف کا مضمون ہے جس میں تخاطب نہیں ہے مگر اس کے معًا بعد بندہ اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، یہ بلاغت کی انتہائی حسین شکل ہے۔

یہاں تک شاعر نے اپنی فرضی محبوبہ اور اس کے اوصاف صورت و سیرت کا ذکر کیا ہے، اب یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ وہ حسین و خود آرا کہیں دور چلی گئی ہے، اس کے گھر والے اس کو اتنی دور لے گئے ہیں جہاں تک پہونچنے کے لیے طاقتور اور مضبوط اونٹنیوں کی ضرورت ہے اور اس اونٹنی کو کیسا ہونا چاہیے اس کے اوصاف سنیے۔

أمسَتْ سُعَادُ بأرضٍ مَا يُبَلِّغُهَا   إلّا العِتَاقُ النَّجِيبَاتُ المَرَاسِيلُ

سر شام سعاد ایسی بستی میں پہنچ گئی ہے (یاد رہے کہ قافلے خاص طور پر جن میں خواتین ہوں، سر شام کہیں پڑاؤ کرتے تھے) جہاں صرف اچھے نسل کی اصیل، تیز رو اونٹنیاں ہی پہونچ سکتی ہیں جو تھکنے کے بعد بھی تیز گام و تیز رو ہوتی ہیں۔

وَلَنْ يُبَلِّغَهَا إلّا عُذَافِرَةٌ   فِيهَا عَلَى الأَيْنِ إرْقَالٌ وتَبْغِيلُ

اور اس بستی تک صرف چوڑے چکلے ہڈیوں والی ایسی اونٹنیاں پہونچ سکتی ہیں جو تھکنے کے بعد بھی تیز گام و تیز رو ہوتی ہیں۔

عذافرة مضبوط اور چوڑے ہڈی والی اونٹنی کو کہتے ہیں، الأين کے معنی تھکا دینا، إرقال تھکے ہوئے جانور کا تیز بھاگنا، تبغیل اونچے نیچے راستہ پر تیز دوڑنا۔

مِنْ كُلِّ نَضَّاخَةِ الذِّفْرَى إذَا عَرِقَتْ   عُرْضَتُهَا طَامِسُ الأَعْلامِ مَجْهُولُ

جب بھی وہ پسینہ آلود ہوتی ہے تو اس کے کان کی لو سے پسینے کی دھار جاری رہتی ہے اور اس کی ہمت کے آگے انجان راستے ہوتے ہیں۔

الذفری کان کی لو کو کہتے ہیں، جب اونٹنی کو پسینہ نکلتا ہے تو سب سے پہلے اسی جگہ سے ٹپکتا ہے نضاخة فوارہ کو کہتے ہیں، نضاخة الذفری، صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے جو مبالغہ پر دلالت کرتا ہے، یعنی ایسے کان والی اونٹنی جس سے پسینہ فوارہ کی طرح پھوٹتا ہے، عرضة ہمت کے معنی میں ہے، طامس الأعلام، اعلام، نشان راہ، طامس مٹے ہوئے، یہاں بھی صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے یعنی وہ راستے جن کے نشانات مٹے ہوئے ہیں اور جن کی سمت کا پتہ نہیں چلتا، ان پر یہ اونٹنی اگرچہ تھکی ہوئی ہوتی ہے اور پسینے میں شرابور ہوتی ہے پھر بھی بھاگتے ہوئے چلتی ہے(۱)

تَرْمِي الغُيُوبَ بِعَيْنَيْ مُفْرَدٍ لَهِقٍ   إذا تَوَقَّدَتِ الحِزَازُ وَالمِيلُ

ضَخْمٌ مُقَلَّدُهَا عَبْلٌ مُقَيَّدُهَا   فِي خَلْقِهَا عَنْ بَنَاتِ الفَحْلِ تَفْضِيلُ

وہ ان دیکھی راہ کو اجلے رنگ کے بیلوں کی آنکھوں سے دیکھتی ہے، جب اس کے سامنے ریت کے تودے اور اونچے ٹیلے نظر آتے ہیں۔ (بعض نسخوں میں ترمی کے بجائے ترى الغیوب دیکھتی ہے انجان راستے) اور ترمی الغیوب کے معنی ہوئے ارادہ یا قصد کرتی ہے انجان راستوں کا، یعنی نڈر ہے اور راستے اس کو خوب معلوم ہیں۔

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ جب اونٹنی اپنا سفر طے کرتی ہے تو کچھ راستے کھلے، کشادہ اور صاف

---

(۱) نضاخة الذفری اور طامس الأعلام کو میں نے اضافت صفت کی موصوف کی طرف کہا ہے، قدیم نحوی اصطلاح میں یہ بات جائز نہیں ہے، وہ موصوف محذوف مانتے ہیں، لہٰذا کہیں گے کہ دراصل ناقة نضاخة الذفری اور طریق طامس الاعلام تھا، مفہوم ایک ہی ہے۔

ہوتے ہیں جن پر چلنا آسان ہوتا ہے اور ہر سواری کے جانور بآسانی راستہ طے کر لیتے ہیں، لیکن بعض راستے ایسے ہوتے ہیں جن میں سامنے ٹیلے آجاتے ہیں اور سوار اور سواری کو معلوم نہیں ہوتا کہ آگے راستہ کیسا ہے ریگستان میں آندھیوں سے ریگ اڑ اڑ کر ایک جگہ ڈھیر ہو جاتی ہے اور اس کی شکل پہاڑ کی بن جاتی ہے وہ بھی ان دیکھا راستہ اور اندھا موڑ ہوتا ہے، عیوب کے لفظ سے اسی طرح کے راستے مقصود ہیں، ترمی کے معنی قصد اور ارادہ کرنے کے ہیں، یعنی یہ اونٹنی ان دیکھے راستے اور اندھے موڑ کی طرف بھی چلنے کی ہمت کرتی ہے اور اپنا راستہ دیکھ لیتی ہے، جس طرح سفید جنگلی بیل کی آنکھیں دور تک دیکھ لیتی ہیں کہ کہاں پر شکاری چھپا بیٹھا ہے، آج کل شاہین کی آنکھ سے مثال دی جاتی ہے مگر بدویانہ زندگی میں تیز بینی اور دوربینی کے لیے جنگلی بیل کی مثال دی جاتی ہے، مفرد جنگلی جانور لھق جنگلی بیل الحزّاز پتھریلا اور سخت راستہ، اس کا مفرد حزیز ہے، المیل، مَیلاء کی جمع ہے، ریگ کا وہ پہاڑ جو آندھیوں سے دفعۃً بن جاتا ہے۔
۲۔ اس کی گردن بھاری ہے، اس کے قدم مضبوط ہیں، اس کی بناوٹ سانڈنیوں سے بڑھ کر بھاری بھرکم ہے۔

مقلّد وہ جگہ جہاں پر قلادہ ڈالا جائے، یعنی گردن، مُقیّد وہ جگہ جہاں پر بیڑی ڈالی جائے یعنی پاؤں، ضخم اور عبل کے معنی بھاری بھرکم اور مضبوط کے ہیں، خلق کے معنی ظاہری سراپا، فَحل سانڈ کو کہتے ہیں، بنات الفحل سانڈنیاں،

غَلْبَاءُ وَجْنَاءُ عُلْكُومٌ مُذَكَّرَةٌ فِي دَفِّهَا سَعَةٌ قُدَّامُهَا مِيْلُ

اس اونٹنی کی گردن موٹی، اس کے تھوتھنے بھاری، مادہ ہوتے ہوئے نر کے مشابہ، گردن کا نچلا حصہ چوڑا، اور اس کی ٹانگیں لانبی ہیں

غلباء موٹی گردن والی، وجناء، وجنۃ کی جمع ہے، رخسار (جانور کے لیے تھوتھنے) العلکوم سخت، مذکرۃ وہ مادہ جو نر کے مشابہ ہو، دف پہلو قدام اگلا حصہ یا آنے والا راستہ، میل لمبا راستہ، مفہوم یہ ہے کہ اس کی ٹانگیں لانبی ہیں، میل کے معنی دو فرسخ کی مسافت لیا ہے، یعنی وہ ایک میل کے فاصلے سے چیزوں کو دیکھ لیتی ہے الصحاح للجوھری میں اس کے معنی اس نشان منزل کے ہیں جو راستہ بتانے کے لیے پہاڑ پر لگا

دیئے جاتے تھے،

وَجِلْدُهَا مِنْ أُطُومٍ لَا يُؤَيِّسُهُ طِلْحٌ بِضَاحِيَةِ الْمَتْنَيْنِ مَهْزُولُ

اس اونٹنی کی کھال (بہت چکنی اور سپاٹ ہونے کی وجہ سے) بحری کچھوے کی مانند ہے، اس کے جسم کے ان حصوں کو جو آفتاب کے رخ پر ہوتے ہیں کلنی یا چچڑی اپنے قابو میں نہیں کر سکتی یا کمزور نہیں کر سکتی۔

جب اونٹوں کے قافلے ریگستان سے گذرا کرتے تھے تو ان کی پیٹھ اور پیٹ پر جوئیں کے مانند ایک کیڑا جس کو کلنی یا چچڑی کہتے ہیں، چمٹ جایا کرتا تھا جسکی وجہ سے اونٹ بے قابو ہو جایا کرتا اور سخت تکلیف محسوس کرتا تھا، اس کو ایک خاص طریقہ سے چھڑایا جاتا ہے اس کو چموکن بھی کہتے ہیں، شاعر اپنی افسانوی اونٹنی کی صفت بتا رہے ہیں کہ اس کا جسم بہت چکنا ہے، اس پر کلنی لگ ہی نہیں سکتی جو اس کی رفتار کو کم کرے اور اونٹنی کو کمزور کرے، اُطوم دریائی کچھوا، کچھ لوگوں نے زرافہ لکھا ہے، یؤیِّسُہ، یُذَلِّلُہٗ، قابو میں کرنا، نیچا دکھانا، طِلح کلنی، چچڑی یا چموکن، مھزول کمزور، طلح کی صفت ہے، ضاحیۃ المتنین دونوں شانے، اونٹ کے لیے اگلے دونوں قدم کا بالائی حصہ جس پر دھوپ پڑتی ہے۔

حَرْفٌ أَخُوهَا أَبُوهَا مِنْ مُهَجَّنَةٍ وَعَمُّهَا خَالُهَا قَوْدَاءُ شِمْلِيلُ

پہاڑی پتھر کے کنارے کی طرح مضبوط ایک اصیل قوی اونٹنی سے اس کا وجود عمل میں آیا ہے، اس کا بھائی اس کا باپ ہے، اس کا چچا وہی ہے جو اس کا ماموں ہے، اس کی پیٹھ چوڑی اور لانبی اور وہ خود تیز گام ہے۔

حرف کنارے کو کہتے ہیں، اونٹنی کی تعریف میں حرف ہونے کا مطلب پہاڑی پتھر کے کناروں کی طرح مضبوط اور سخت، اُخوھا اُبوھا۔ عمھا خالھا کا مطلب ہے کہ ایک ہی گھرانے اور ایک ہی نسل کی اونٹنی ہے۔ دوسرے گروہ کے اونٹ اور اونٹنیاں اس کے خون میں شریک نہیں ہیں، جانوروں میں تولید کے قوانین انسانوں کی طرح نہیں ہوتے۔ محرمات کا احساس صرف بنی آدم میں ہے جس کو اسلام نے قانونی شکل دے کر دوام بخش دیا ہے، ان جانوروں میں بیٹا شوہر بن جاتا ہے اور کبھی بھائی شوہر بن جاتا ہے، اسی طرح ایک ہی نسل

دراصل کے اونٹ باہم تولیدی رشتے سے ایسے ہو جاتے ہیں کہ بھائی باپ بن گیا اور ماموں چچا ہو گیا ہے، بعض شراح نے اس پیچیدہ رشتے کو تشریح کر کے بتایا ہے جو تکلف سے خالی نہیں ہے۔

يَمْشِي القُرَادُ عَلَيْهَا ثُمَّ يُزْلِقُهُ مِنْهَا لَبَانٌ وَأَقْرَابٌ زَهَا لِيلُ

اس اونٹنی کے جسم پر کلنی (یا چمونکن) چلتی ہیں تو اس کا سینہ اور اس کے کولہے ان کو پھسلا کر گرا دیتے ہیں۔

اونٹ جب بیٹھتا ہے تو زمین سے اس کے کولہے اور سینہ لگ جاتا ہے اور اس کے جسم کے یہ حصے دوسرے اجزاء کی نسبت سخت ہوتے ہیں اور بہت کھردرے ہوتے ہیں، مگر یہ اونٹنی ایسی ہے کہ اس کے جسم کے یہ حصے بھی اتنے چکنے ہیں کہ ان پر کلنی بیٹھے تو پھسل کر گر جائے، دوسرے اجزاء جو نرم ہیں وہ اور بھی چکنے ہوں گے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ اونٹنی تیز رفتار ہے، اور اونٹ کی تیز گامی روکنے والی چیز کلنیاں ہوا کرتی ہیں جن کا یہاں گذر نہیں۔

قراد جمع قرد کلنی، لَبَان سینہ اقراب جمع قرب کمر یا کولہا، جو جسم میں دائیں بائیں دونوں طرف ہوتا ہے، ان کو تثنیہ کے بجائے جمع استعمال کیا ہے، قرآن کریم میں اس کی مثال ہے (فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا) "تم دونوں کے دل مائل ہو گئے" یہاں پر بجائے قلبا کما کے قلوبکما جمع مستعمل ہے۔

عَيْرَانَةٌ قُذِفَتْ بِالنَّحْضِ عَنْ عُرُضٍ مِرْفَقُهَا عَنْ بَنَاتِ الزَّوْرِ مَفْتُولُ

وہ اونٹنی حمار وحشی یعنی جنگل میں آزاد، تیز رو گاؤ خر کی طرح ہے، ہر طرف سے پر گوشت ہے، اس کی کہنی اس کے سینے کی ہڈیوں (پسلیوں) سے دور ہے۔

عَیر جنگلی گائے نما جانور کو کہتے ہیں اردو میں ترجمہ گدھا کیا جاتا ہے مگر یہ دوسرے ہی طرح کا جانور ہوتا ہے، عیرانۃ اسی کے مماثل اونٹ کو کہتے ہیں، تشبیہ اس بات میں ہے کہ گاؤ خر بہت تیز بھاگتا ہے، اسی طرح یہ اونٹ یا اونٹنیاں تیز گام ہوتی ہیں۔

نَحض ران اور دست کے گوشت کو کہتے ہیں، قذف پتھر مارنے کو کہتے ہیں، جیسے خذف کنکر مارنے کو، گوشت کے لیے یہ فعل مجاز ہے، مطلب ہے کہ پر گوشت بنایا گیا، عرض پہلو کو کہتے ہیں، یعنی اس کے پہلو کو پر گوشت بنایا گیا ہے، مفتول دوہرا، بٹا ہوا، الزور

سینہ، بنات الزور پسلیاں، اس کی پسلیاں اس کی کہنی سے دور رکھی گئی ہیں، ان اشعار میں الفاظ کا تنوع ضرور ہے مگر مفہوم میں کوئی ندرت نہیں ہے۔

كَأَنَّمَا فَاتَ عَيْنَيْهَا وَمَذْبَحَهَا مِنْ خَطْمِهَا وَمِنَ اللَّحْيَيْنِ بِرْطِيلُ

گویا اس کے چہرہ کا وہ حصہ جو اس کے منہ اور ناک سے لے کر اس کی آنکھوں تک ہے اور اس کی نکیل کی جگہ سے لے کر اس کے جبڑوں تک ہے وہ ایک لوہے کے بنے ہوئے آرے کی مانند ہے۔

اس شعر میں لفظ فات ہے یا قَاب تصحیف کی وجہ سے مشتبہ ہے، شرح کرنے والوں میں کسی نے فات لکھا ہے جیسا کہ شیخ ابراہیم الباجوریؒ اور شیخ اسماعیل بنہانی نے لکھا ہے، یا قَاب جیسا کہ شیخ احمد بن شمس الدین دولت آبادی نے لکھا ہے۔ بہرحال معنی دونوں کے تقریباً ایک ہی ہیں، یعنی اگر قاب ہے جس کا ترجمہ فاصلہ کیا جاتا ہے (قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی آنکھوں اور گردن تک فاصلہ، اور اسکی ناک اور جبڑے تک کا حصہ فولادی ہے۔ اور اگر فَاتَ ہے تو اس کا مطلب ہوگا ان اجزائے جسم کا فاصلہ آہنی آرے ہے مطلب یہ ہے کہ یہ اونٹنی ایسی ہے کہ اس کا سر بڑا بھاری بھرکم ہے اور اس کی گردن لانبی ہے گویا آہن و فولاد کے پٹھے، سلاخوں کی رگیں ہیں۔

مَذبح گردن، جہاں ذبح کرتے وقت چھری چلائی جاتی ہے، خطم جہاں نکیل پہنائی جاتی ہے۔ اللحیۃ جبڑا، برطیل فولاد کا بنا ہوا آرا۔

تُمِرُّ مِثْلَ عَسِيبِ النَّخْلِ ذَا خُصَلٍ فِي غَارِزٍ لَمْ تَخَوَّنْهُ الأَحَالِيلُ

وہ اپنی دم کو جو شاخ نخل (کھجور کی ٹہنی) کی مانند لانبی ہے اور جس پر بالوں کے گچھے ہیں، اپنے ایسے تھن پر پھیرتی ہے جس نے دودھ دینے میں کمی نہیں کی۔

مطلب یہ ہے کہ اس کی دم لانبی ہے اور دم کے بال گھنے ہیں اور اپنے تھن کو وہ دم سے جھاڑتی رہتی ہے تاکہ اس پر مکھی نہ بیٹھے۔

عسیب کھجور کی ٹہنی کو کہتے ہیں جس میں کھجور کے خوشے نہ لگے ہوں، غارز تھن تخون کم کرنا، احالیل، اِحلیل کی جمع ہے دودھ نکلنے کی جگہ، ضرع تھن کو کہتے ہیں اور احلیل اس کا وہ حصہ جہاں سے دودھ نکلتا ہے۔

قَنْوَاءُ فِي حُرَّتَيْهَا لِلْبَصِيرِ بِهَا عِتْقٌ مُبِينٌ وَفِي الْخَدَّيْنِ تَسْهِيلُ

اس اونٹنی کی ناک گاؤدم ہے، اونٹوں کے معاملہ میں جو لوگ صاحب نظر ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کے دونوں کان کھلے ہوئے اصیل اور خاندانی ہونے کی دلیل ہیں اور اس کے رخسار میں نرمی ہے۔

اچھی ذات کے اونٹوں اور اونٹنیوں کے کان خاص انداز کے ہوتے ہیں، وہ لوگ جو اونٹ پالتے ہیں اور صاحب نظر ہیں وہ ان کو دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ کس ذات کے یہ اونٹ ہیں۔

حرتان زیادہ ناموس لفظ ہے، جو کسی قبیلہ میں بولا جاتا تھا، روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے پوچھا کہ بتاؤ حرتان کیا ہیں؟ کسی نے کہا آنکھیں، آپؐ نے فرمایا: هما اُذناها وہ دونوں اس کے کان ہیں، لغت کے لحاظ سے کان کی لو جس سے پسینہ ٹپکتا ہے۔

قنواء اس اونٹنی کو کہتے ہیں، جس کی ناک اوپر سے لانبی ہو اور نیچے کی طرف موٹی، گاؤدم ہو، اس کا مذکر أَقْنیٰ ہے جس کے معنی ناک کا وسط سے اونچا ہونا پھر نیچے کی طرف کجی کی طرف مائل ہونا (الصحاح)

تَخْدِي عَلَى يَسَرَاتٍ وَهِيَ لَاحِقَةٌ ذَوَابِلٍ مُسُّهُنَّ الْأَرْضَ تَحْلِيلُ

یہ اونٹنی اپنے ہلکے اور سبک پیروں سے دوڑتی ہے، وہ پاؤں جو خشک لکڑی کے بنے ہوئے نیزوں سے زیادہ سخت ہیں اور وہ ان اونٹوں سے جا ملتی ہے جو آگے جا چکے ہیں اور اپنی تیز رفتاری سے اس طرح چلتی ہے کہ زمین پر اس کے پاؤں بس قسم کھانے کے لیے پڑتے ہیں،

مطلب یہ ہے کہ اس اونٹنی کے پاؤں بھاری بھرکم نہیں ہیں جو چلنے میں سستی کریں بلکہ ہلکے پھلکے ہیں اور ایسے ہلکے پھلکے جیسے نیزے جو دیکھنے میں پتلے ہوتے ہیں مگر بہت مضبوط اور سخت اور اس اونٹنی کا دوسرا کمال یہ ہے کہ بہت سے آگے نکلے ہوئے یعنی پہلے کے چلے ہوئے اونٹوں سے مقابلہ کرتی ہے اور ان سے سبقت لے جاتی ہے اور اتنا تیز دوڑتی ہے کہ جیسے زمین پر اس کے پاؤں بس قسم کھانے کے لیے پڑتے ہیں۔ قسم کھانے کے لیے تحلیل قسم یا تحلۃ القسم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قسم اتارنے کے لیے کوئی کام کیا جائے، مثلاً کسی نے قسم کھائی کہ ہم فلاں کو سو ڈنڈے ماریں گے، مگر اس کے بجائے سو تنکوں کا جھاڑو اس کے جسم سے چھلا دے۔

تَخْدِي، تَرْمِي کے وزن پر تیز دوڑتی ہے، يَسَرَات ہلکے پاؤں، لاحقة کا مطلب ہے آگے جانے والے یا پہلے سے سفر پر نکلنے والے سے مل جانا، ذوابل کے معنی ہیں خشک، اس کو تنوین کے ساتھ ضرورت شعری کی وجہ سے پڑھا گیا ہے، مَسُّ چھونا مصدر ہے، تحلیل کے معنی بیان کیے جا چکے، شیخ اسماعیل نبہانی کے مجموعہ میں لاحقة کے بجائے لاهية کہا ہے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ اونٹنی جبکہ بے پروائی سے بھی چلتی ہے تو اتنی تیز ہوتی ہے کہ زمین پر اس کے پاؤں بس برائے نام ہی پڑتے ہیں۔

سُمْرُ الْعُجَايَاتِ يَتْرُكْنَ الْحَصَىٰ رَيْمًا لَمْ يَقِهِنَّ رُؤُسَ الْأَكَمِ تَنْعِيلُ

اس اونٹنی کے کھر سیاہی مائل ہیں (اور اس درجہ سخت ہیں کہ) پہاڑیوں کے بالائی حصہ پر جہاں پتھر ناہموار ہوتے ہیں اور جس پر چلنے کے لیے اونٹوں کے نعل کافی نہیں ہوتے وہاں کے پتھروں کو یہ اپنی چال سے بکھیر دیتی ہے۔

سُمْرٌ اسمر کی جمع ہے، سیاہی مائل، عجاية اونٹ کے گھٹنے سے لے کر کھر تک کا نچلا حصہ، رِيَمًا متفرقًا یعنی کسی ڈھیر کو توڑ دینا اور ان چیزوں کو متفرق کر دینا، لَمْ يَقِهِنَّ وقی، یقی سے، نہیں بچاتی ہیں، اکم، اکمة کی جمع، پتھروں کے ڈھیر، رؤس الأكم پہاڑوں کی چوٹی پر پڑے ہوئے یکجا پتھر جہاں کوئی راستہ نہیں ہوتا، تنعیل چوپایوں کو لوہے کی کیلوں سے جڑ کر ایک حلقہ پہنا دینا جس کو نعل بندی کہتے ہیں، کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اس ناہموار پتھریلے راستے پر جہاں جانوروں کو انکی نعل بندیاں ان کو زخمی ہونے سے نہیں بچا سکتیں وہاں یہ اونٹنی دوڑتی ہوئی جاتی ہے اور ان پتھروں کو ادھر ادھر بکھیر دیتی ہے۔

كَأَنَّ أَوْبَ ذِرَاعَيْهَا إِذَا عَرِقَتْ وَقَدْ تَلَفَّعَ بِالْقُورِ الْعَسَاقِيلُ

يَوْمًا يَظَلُّ بِهِ الْحِرْبَاءُ مُصْطَخِدًا كَأَنَّ ضَاحِيَهُ بِالشَّمْسِ مَمْلُولُ

وَقَالَ لِلْقَوْمِ حَادِيهِمْ وَقَدْ جَعَلَتْ وُرْقُ الْجَنَادِبِ يَرْكُضْنَ الْحَصَىٰ قِيلُوا

شَدَّ النَّهَارِ ذِرَاعَا عَيْطَلٍ نَصِفٍ قَامَتْ فَجَاوَبَهَا نُكْدٌ مَثَاكِيلُ

چونکہ چاروں اشعار ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور پہلے شعر میں (كَأَنَّ) گویا کہ، کا جواب آخری شعر میں ہے، اس لیے ایک ساتھ ترجمہ و تشریح کے طالب ہیں۔

پہلے ان چاروں اشعار کا مفہوم بیان کرتا ہوں پھر الفاظ و ترکیب کی تشریح کی جائے گی،
جب تیز گامی اور گرمی کی شدت کی وجہ سے یہ اونٹنی پسینہ سے بھیگ جاتی ہے اور گرمی کی شدت
کا یہ عالم ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں سراب سے ڈھک جاتی ہیں، اور ایسی سخت گرمی جس میں گرگٹ
ایسا جانور جو گرمی کا عادی ہے وہ بھی بھن جائے، اور جس وقت گرمی کی شدت سے بیابانی خاکستری
رنگ کی ٹڈیاں جلتے ہوئے پتھروں پر پاؤں مارتی ہوں اس وقت وہ اونٹنی اتنی تیزی سے اپنے
پیر پیٹ کی طرف پھیرتی ہے جیسے ایک پختہ عمر کی عورت اپنی اولاد کے مرنے پر زور زور سے سینہ کوبی
کرتی ہو، اور اس کو دیکھ کر دوسری خواتین بھی جو اولاد کا غم اٹھا چکی ہیں اپنے سینے پر تھپڑے مارتی ہیں۔

شاعر تشبیہ یہ دینا چاہتے ہیں کہ جب سینہ کوبی کے لیے پختہ عمر کی عورت زور زور سے تیزی
کے ساتھ اپنے ہاتھ چلاتی ہے تو اس کے ہاتھ کے اٹھنے اور سینے پر پڑنے میں کوئی وقفہ نہیں معلوم ہوتا۔

اب الفاظ سے اس مفہوم کو مطابق کیجیے، پہلے شعر میں کان اُوب ذراعیہا گویا کہ اس کے
اگلے دونوں پاؤں (ذراع، بازو) کی واپسی (یعنی پیچھے کی طرف مڑنا)۔ چوتھے شعر۔ ان بازوؤں
کی طرح ہے جو پختہ جواں سال عورت (جو نہ کمسن ہو نہ ادھیڑ (نصِف) جس کے بچے مر گئے ہوں
(عیطل) دھوپ کی شدت میں (شد النہار) دھاڑیں مار مار کر روتے اور سینہ کوبی کرتے
وقت تابڑ توڑ بازو چلا رہی ہو، اور کن حالات میں تیز تیز چل رہی تھی (پہلے شعر) جب تھک کر
پسینہ پسینہ ہو رہی تھی اور دھوپ اس قدر تیز تھی کہ سامنے کی پہاڑی سراب سے ڈھکی تھی، تلفع
ڈھک گئی، عساقیل ریت جو پانی کی طرح نظر آتی ہے، قود پہاڑی، واضح رہے کہ عساقیل
جمع ہے مگر اس کا کوئی مفرد نہیں ہوتا، دوسرے شعر میں گرمی کی تصویر کشی ہے کہ گرگٹ (حرباء)
جو گرمی اور دھوپ کا عادی ہے وہ جلا بھنا نظر آتا ہو (مصطخب) گویا کہ وہ دھوپ کی چادر میں
ڈھکا ہوا ہے اور ایسی گرمی جب کہ حدی خواں جو کہ دوسروں کو ہمت دلایا کرتا ہے وہ لوگوں سے کہے
(قیلوا) قیلولہ کر لو یعنی آرام کر لو، کیونکہ اس وقت خاکستری رنگ (ورق) کی ٹڈیاں (جنادب)
(یرکُفْنَ) زمین پر لوٹ رہی ہیں۔ (شد النہار) چوتھے شعر، دھوپ کی تیزی (عیطل)
وہ عورت جس کے بچے مر گئے ہوں۔ (نَصِف) ادھیڑ عمر کی عورت، نہ کمسن نہ بوڑھی مگر مضبوط
وتندرست، (جاوب) ساتھ دیا (نکد) نگلین عورتیں (مثاکیل) جن کو اولاد کے مرنے

اغم ہو، صفت عیطل،

خلاصہ ان چاروں اشعار کا یہ ہے کہ سخت ترین گرمی لو کی شدت میں یہ اس طرح دوڑتی ہے
جیسے کوئی مضبوط ہاتھ پاؤں کی عورت تابڑ توڑ اپنے سینے پر ہاتھ مار رہی ہو،

نَوَّاحَةٌ رِخْوَةُ الضَّبْعَيْنِ لَيْسَ لَهَا لَمَّا نَعَى بِكْرَهَا النَّاعُونَ مَعْقُولُ

(اس اونٹنی کے اگلے پاؤں کی حرکت ایسی تیز ہے جیسے) اس نوحہ خواں کے ہاتھوں کی حرکت
جس کے دونوں بازو نرم ہوں اور اس وقت جب کہ اس کی پہلوٹی اولاد کے فوت ہونے کی خبر
اس کو سنائی گئی ہو تو وہ بندش میں نہ ہو۔

نَوَّاحة، نائحة کا مبالغہ، بکثرت نوحہ خوانی کرنے والی، رخوة نرم، ضبعین
بمعنی عضدین دونوں بازو، معقول باندھا ہوا، قابو میں کیا ہوا، بعض اردو کے مترجمین
نے یہ مطلب لیا ہے کہ جس کی عقل جاتی رہی ہو، لیس لها معقول، یعنی مفعول بمعنے
فعل، معقول بمعنی عقل، مگر یہ صحیح نہیں ہے، عقل کے معنی بندش کے آتے ہیں، حضرت
کعبؓ اپنی مفروضہ اونٹنی کی تیزی بتانے کے لیے یہ تشبیہ دے رہے ہیں کہ فرض کرو ایک
عورت، اس کے بازوؤں میں طاقت بھی ہے اور اس کے بار بار حرکت کرنے سے کوئی بات
مانع بھی نہیں ہے، یعنی کوئی سختی نہیں ہے، بلکہ نرم ہیں اور اس پر اچانک غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا
ہو، اس کے پہلوٹے بیٹے کی موت کی خبر سنائی گئی ہو، وہ جس طرح اپنے سینے پر ہتھڑ چلائے گی
اسی طرح اس اونٹنی کے پاؤں تیزی، سبک روی اور جوش کے ساتھ پڑتے ہیں، (بکر)
پہلے پہل پیدا ہونے والی اولاد، لڑکا ہو یا لڑکی (نعی) موت کی خبر سنانا، ناعون موت کی
خبر سنانے والے۔

عربی داں حضرات کے لیے یہ بات دلچسپی کی ہوگی کہ اس شعر کا پہلا لفظ نواحة اور
اس کی صفت رخوة الضبعین کو آپ تینوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔

نَوَّاحةٌ مبتدا ھی محذوف مانا جائے ھی نواحة،

نَوَّاحةً، اعنی (فعل با فاعل) محذوف مانا جائے۔

نَوَّاحةٍ گذشتہ شعر کے لفظ عطل کی صفت مانا جائے،

لیکن قابل ترجیح رفع نواحۃ ہے کیونکہ مبتدا عام طور پر اس طرح کے جملوں یا مصرعوں میں محذوف مانا جاتا ہے۔

تَفْرِی اللَّبَانَ بِکَفَّیْهَا وَمِدْرَعُهَا مُشَقَّقٌ عَنْ تَرَاقِیهَا رَعَابِیلُ

وہ غمزدہ عورت اپنی ہتھیلیوں سے اپنے سینے کو کوٹ رہی ہے اور اس کا گریبان پارہ پارہ ہوگیا، اس کے سینے کا بالائی حصہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے — اور یہ سب اس لیے کہ وہ مسلسل بے تکان اپنے سینے پر تابڑ توڑ تھپڑ مار رہی ہے جس طرح ہماری اونٹنی ہر حال میں تیز تیز قدم اٹھایا کرتی ہے۔

تَسْعَی الْوُشَاةُ جَنَابَیْهَا وَقَوْلُهُمْ إِنَّكَ یَا ابْنَ أَبِی سُلْمَی لَمَقْتُولُ

لگائی بجھائی کرنے والے اونٹنی کے دونوں جانب دائیں بائیں دوڑ رہے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اے ابوسلمی کے فرزند! تم قتل کر دیے جاؤ گے، جناب، جنب سے کنارہ کے معنی میں، بعض نسخوں میں جانبیها بھی آیا ہے،

قصیدہ کا گریز یہاں سے شروع ہو رہا ہے۔ پورے قصیدے کی ترتیب از سر نو سمجھ لی جائے تاکہ مفہوم واضح رہے، قصیدہ شروع ہوا اس مضمون سے کہ شاعر کی فرضی محبوبہ سعاد اپنے قافلہ کے ساتھ چلی گئی، اس کی آواز، قد و قامت اور جسم کے گداز پر شاعر فریفتہ ہے مگر وہ انتہائی ترش رو، وعدہ خلاف، اور بے وفا ہے، اس کی صورت اچھی اور سیرت ناپسندیدہ ہے، اس کو بھی شاعر برداشت کر لیتا مگر وہ بہت دور، بہت دور نکل گئی ہے، ایسی جگہ چلی گئی ہے جہاں ایک مضبوط، تیز رو، اونٹنی جا سکتی ہے، اس اونٹنی کو کیسا ہونا چاہیے، اس کے اوصاف پیشانی، تھوتھنے، ٹانگوں سے لیکر کھر اور نعل تک بیان کیے گئے۔ گویا کہ وہ اونٹنی چل رہی ہے، دوڑ رہی ہے سخت گرمی اور تپش کی حالت میں جب کسی سے دو قدم نہ چلا جاتے وہ رواں دواں ہے اور اس قدر تیز ہے کہ زمین سے اس کے پاؤں نہیں لگتے، گویا اڑ رہی ہے اور اس اونٹنی کے ساتھ ساتھ چغل خور بلکہ لگائی بجھائی کرنے والے بھی رواں دواں ہیں وہ مجھکو دھمکی دے رہے ہیں کہ تم قتل کر دیے جاؤ گے، اور اب یہ عالم ہے کہ

وَقَالَ كُلُّ خَلِیلٍ كُنْتُ آمُلُهُ لَا أُلْهِیَنَّكَ إِنِّی عَنْكَ مَشْغُولُ

اور ہر محب صادق جس سے میں توقع کر سکتا تھا کہ وقت مصیبت کام آئے گا وہ کہتا ہے کہ میں تم کو بہلاوا نہیں دیتا ہوں تم سے جو ہو سکتا ہے کر گذرو، مجھے تمہارے علاوہ اور کام ہیں جنمیں میں مشغول

ہوں۔

یہاں عربی زبان سے واقف حضرات نوٹ کر لیں کہ عربی کے وہ صیغے جن کو ماضی، حال، مستقبل میں تقسیم کرتے ہیں اور اس کا ترجمہ اسی طرح کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ اہل زبان کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتے، یہاں قال حال کے معنی میں ہے، قرآن کریم میں مستقبل کے معنوں میں ماضی کے صیغے آئے ہیں اور ان کی تاویلیں کی جاتی ہیں۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔

فَقُلْتُ خَلُّوا سَبِیلِی لَا أَبَا لَكُمُ فَكُلُّ مَا قَدَّرَ الرَّحْمٰنُ مَفْعُولُ

میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ میرا راستہ چھوڑ دو اے مجہول النسب لوگو! خدائے رحمان نے جو فیصلہ کر دیا ہے وہ ہو کر رہے گا،

مطلب واضح ہے، اور نحوی ترکیب بھی سادہ ہے، البتہ ایک استثنائی جملہ جو بددعا یا گالی کا مفہوم رکھتا ہے، لا أبا لكم (اے وہ جس کا کوئی باپ نہیں) اس کا ایک ترجمہ ہے کہ تیرا باپ مرے، دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ اے وہ جس کا باپ نہیں، یعنی باپ کا پتہ نہیں کہ کون تھا، ایک سخت گالی ہے، لیکن جن لوگوں نے عربی نثر و نظم کا گہرا مطالعہ کیا ہے یا جو لوگ زبان کی نزاکتوں کو سمجھتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ دراصل یہ مہمل جملے ہیں، ان کا حقیقی مفہوم نہیں لیا جاتا، بعض قبائل، بعض خاندان کے بڑے بوڑھے کچھ ایسے جملے بے تکان بول جاتے ہیں جن کی لفظی تشریح کی جائے تو بہت بھونڈی اور شریفانہ معیار سے گری ہوئی بات معلوم ہوگی، مگر وہ زبان زد جملے ہو جاتے ہیں جو کبھی غایت محبت اور پیار میں بھی بول جاتے ہیں، اردو میں حلال زادہ کے ٹھیک مقابل ایک لفظ ہے وہ ذرا خفگی میں تو بولتے ہی ہیں کبھی اعتراف کمال میں بھی بول جاتے ہیں، ایک اردو کے بڑے ادیب کے بارے میں نیاز فتحپوری نے لکھا کہ جب انھوں نے داغ کا فلاں شعر سنا تو بیساختہ کہا .... کہتا خوب تھا، اسی طرح اردو میں 'کم بخت' کا لفظ ہے لوگ یہ سوچ کر کہ یہ بددعا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "اے وہ جس کی قسمت خراب ہو چکی یا خراب ہو جائے" نہیں بولتے، ایک جملہ زبان زد ہے بول گئے، اپنے لڑکوں کو، عزیزوں کو، بے تکلف دوستوں کو لوگ اس سے مخاطب کر لیتے ہیں۔

عربی میں ایک جملہ ہے 'تربت یداك' تیرے دونوں ہاتھ خاک آلود ہوں، ہاتھوں کا

خاک آلود ہونا کنایہ ہے فقر و افلاس سے، مگر کیا اس کا مطلب یعنی محل کلام بد دعا ہی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے، حدیث شریف میں آیا ہے:

تنکح المرأة لأربع لمالها ولحسبها ولجمالها ولدینها، فاظفر بذات الدین تربت یداك (متفق علیه)

کسی عورت سے چار باتوں میں سے کسی ایک بات کی وجہ سے شادی کی جاتی ہے، یا تو وہ مالدار ہوتی ہے یا اس کا خاندان بہت معزز ہوتا ہے یا اس کی صورت اچھی ہوتی ہے، یا وہ دین کی پابند ہوتی ہے، لہٰذا دیندار کو حاصل کر لے، تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔

یہ صرف ایک محاورہ اور بولنے کا انداز ہے،

ایک جاہلی شاعر کا شعر ہے:

سَئِمْتُ تَكَالِيْفَ الْحَيَاةِ وَمَنْ يَعِشْ ثَمَانِيْنَ حَوْلًا لَا أَبَا لَكَ يَسْأَمِ

زندگی کی الجھنوں سے اکتا گیا ہوں اور جو بھی اسّی سال جیے گا (تیرا باپ نہ ہو) اکتا ہی جائے گا۔

کیا آپ اس کا ترجمہ کریں گے کہ اے مخاطب لوگو! — یا اس شعر کے پڑھنے والو! تم سب .... ہو، اس سلسلہ میں آخری بات وہ ہے جو علامہ زمخشری نے 'اساس البلاغۃ' میں ذکر کیا ہے کہ بعض بدو آسمان کی طرف دیکھ کر کبھی کہہ اٹھتے تھے، أمطر علینا الماء لا أبا لك اے آسمان برس! تیرا باپ کوئی نہیں،

اس تفصیل کی ضرورت اس لیے پڑی کہ ایک سو برس پہلے کے ایک بزرگ شارح نے "اے مجہول النسب لوگو!" ترجمہ کیا ہے۔

اس شعر میں ایک بات وضاحت طلب ہے کہ حضرت کعب نے 'الرحمٰن' اسم ذات کے طور پر نظم کیا ہے حالانکہ مشرکین قریش کو اس سے انکار تھا، صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے املا فرمایا 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'، تو قریش کے نمائندہ نے کہا:

لا نعرف الرحمٰن ولا الرحیم ولکن اکتب کما کنت تکتب باسمك اللّٰهم.

ہم رحمٰن، رحیم کو نہیں جانتے، وہی لکھئے جو پہلے لکھتے تھے، تیرے نام سے اے میرے اللہ۔

قرآن کریم (سورۂ فرقان) میں ہے:

وإذا قیل لهم اسجدوا للرحمٰن قالوا وما الرحمٰن۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں رحمٰن کیا ہے۔

یہاں پر حرف ما نکرہ کو بتا رہا ہے یعنی وہ کہنا چاہتے ہیں، رحمٰن کو نہ ہم جانتے ہیں نہ اس کا اقرار کرتے ہیں۔

اس وقت ایک جاہلی شاعر کا یہ کہنا فکل ما قدر الرحمٰن مفعول جو رحمٰن نے مقدر کر دیا ہے ہو کر رہے گا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رحمٰن خدا کے لیے اسم ذات کی حیثیت سے اہل کتاب کو معلوم تھا اور جیسا کہ صاحب کشّاف نے لکھا ہے اہل قریش ناواقف تھے اس لیے انکار کرتے تھے۔

حضرت کعبؓ نے بیشک اسلام کا زمانہ پایا اور وہ جاہلی اور اسلامی دونوں عہد کی نمائندگی کرتے ہیں ہو سکتا ہے اپنا منظوم معذرت نامہ پیش کرتے وقت انھوں نے قرآن اور رسول اللہ کے محاورہ کا لحاظ کر کے رحمٰن باندھا ہے کیونکہ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے بعد کا ہے، جب کہ اسلام کا دبدبہ قائم ہو چکا تھا۔ مگر یہ احتمال ہی ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

ایک گمان یہ ہوتا ہے کہ حضرت کعبؓ کی وفات ۴۰ھ یا ۵۰ھ بتائی جاتی ہے، خلافتِ راشدہ کا زمانہ انھوں نے پایا تھا اس وقت چند اشعار بڑھا دیے ہوں گے، شبہ کی وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت کعبؓ کا قصیدہ تواتر کی حد تک صحیح ہے، جب کہ سبعہ معلقہ کے قصائد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان میں بہت کچھ اضافے ہیں، بہر حال یہ ایک ضمنی بحث ہے، اصل قصیدہ جس کا موضوع معذرت و مدح ہے، اس کے اشعار ایک شعر کے بعد شروع ہو رہے ہیں،

كُلُّ ابْنِ أُنْثٰى وَإِنْ طَالَتْ سَلَامَتُهُ يَوْمًا عَلٰى آلَةِ الْحَدْبَاءِ مَحْمُوْلُ

ہر وہ شخص جس کو کسی عورت نے جنم دیا ہے وہ خواہ جس قدر بھی عمر پائے ایک نہ ایک دن جنازہ کی پلنگ پر اٹھایا ہی جائے گا،

آلۃ الحدباء نعش اٹھانے کا چوکٹھا، اس زمانہ میں پلنگ تو ہوتی نہیں تھی، چار پائیوں پر ایک پٹرا رکھ کر میت کو لٹا دیا کرتے تھے اسی کو آلۃ الحدباء کہہ رہے ہیں، مقصد یہ ہے کہ موت سے ڈرنا کیا، ایک نہ ایک دن تو مرنا مقدر ہی ہے۔

أُنْبِئْتُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ أَوْعَدَنِيْ وَالْعَفْوُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ مَأْمُوْلُ

مجھے بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ؐ نے مجھے دھمکی دی ہے، لیکن بخشش و درگذر کی رسول اللہ سے توقع قائم ہے۔

فَقَد أَتَيْتُ رَسُولَ اللهِ مُعْتَذِرًا   وَالعُذْرُ عِنْدَ رَسُولِ اللهِ مَقْبُولُ

یارسول اللہ! میں آپ ؐ کی خدمت میں معذرت خواہ بن کر آیا ہوں، اور عذر رسول اللہ کے نزدیک مقبول ہے۔

مَهْلاً هَدَاكَ الَّذِي أَعْطَاكَ نَافِلَةَ الْـ   قُرآنِ فِيهَا مَوَاعِيظُ وَتَفْصِيلُ
لَا تَأْخُذَنِّي بِأَقْوَالِ الوُشَاةِ وَلَمْ   أُذْنِبْ وَإِنْ كَثُرَتْ فِيَّ الأَقَاوِيلُ

ذرا ٹھہریے آپ کو وہ (اللہ تعالیٰ) ہدایت دے جس نے آپ کو قرآن کا عطیہ دیا ہے، اور وہ قرآن جس میں معاش و معاد کی تفصیل ہے) لگائی بجھائی کرنے والوں کی باتوں پر میری گرفت نہ فرمائیے، درحقیقت میں نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے اگرچہ میرے سلسلہ میں بہت چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں،

نافلۃ اس عطیہ کو کہتے ہیں جو مقررہ اور واجب مقدار سے بڑھ کر دی جائے۔ بعض شارحین قصیدہ کا یہ کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین و دنیا کا علم اور آخرت کی محنت تو دی ہی ہے اس کے علاوہ قرآن کا ہدیہ دیا ہے جس میں نصیحتیں ہیں اور احکام کی تفصیل ہے لیکن یہ مفہوم صحیح نہیں ہے۔ دراصل نافلہ کے معنی ہدیہ و عطیہ کے ہیں، رہا یہ کہ شاعر آنحضرت ؐ کو دعا دے رہے ہیں، هداك الذی أعطاك یہ بھی ان استثنائی فقروں میں سے ہے جو کلام کا وزن پورا کرنے اور جملہ کو دلکش بنانے کے لیے کہا جاتا ہے، ورنہ ہادی بشریت کو ایک شخص ہدایت کی دعا دے جو خود معذرت نامہ لے کر توبہ کرنے آیا ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

لَقَدْ أَقُومُ مَقَامًا لَوْ يَقُومُ بِهِ   أَرَى وَأَسْمَعُ مَا لَوْ يَسْمَعُ الفِيلُ
لَظَلَّ يَرْعَدُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ لَهُ   مِنَ الرَّسُولِ بِإِذْنِ اللهِ تَنْوِيلُ

میں ایسی جگہ پر کھڑا ہوں کہ اگر یہاں پر کوئی ہاتھی کھڑا ہوتا اور جو میں دیکھ سن رہا ہوں وہ اگر دیکھتا سنتا تو وہ ہاتھی بھی خوف سے کانپ رہا ہوتا۔ الّا یہ کہ اللہ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بخشائش عطا کر دی ہوتی۔

یہ دونوں شعریوں تو مفہوم کے لحاظ سے واضح ہیں کہ حضرت کعبؓ یہ فرماتے ہیں ایک مجرم کی حیثیت سے جس جگہ پر کھڑا ہوں اور جو اپنے بارے میں سن رہا ہوں کہ مجھے ہلاک کر دیے جانے کا حکم صادر ہو چکا ہے، اس جگہ پر انسان کیا اگر ہاتھی جیسے جسیم و ضخیم جانور بھی کھڑا ہوتا تو وہ بید لرزاں کی طرح کانپ رہا ہوتا البتہ ہمت دلانے والی چیز ایسے مقام پر یہی ہو سکتی ہے کہ حکم خداوندی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاف فرما دیں اور بخشائش ہو جائے ـــ لیکن عربی ترکیب کے لحاظ سے اس میں کچھ پیچیدگی ہے، یقوم و یسمع اور اریٰ و اسمع دو دو فعل ہیں اور الفیل کا لفظ فاعل یا مفعول بن سکتا ہے اس کو اصطلاح نحوی میں تنازع الفعلین کہتے ہیں، لیکن مطلب واضح ہے اس لیے یقوم اور یسمع کا فاعل الفیل قرار دیا گیا، پھر بھی تعقید سے شعر خالی نہیں ہے، دوسرے یہ کہ ایک بدوی نے فیل کب اور کہاں دیکھا تھا کہ اس کی مثال دے رہا ہے، لہٰذا اس شعر کے الحاق ہونے کا شبہ کیا گیا ہے، جس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ صحرائے عرب میں نہ سہی یمن اور اس سے متصل قبائل کے جنگلات میں ہاتھی ہوتے تھے، اور ابرہہ کی فوج ہاتھیوں پر مشتمل تھی، سورہ فیل اس کا شاہد ہے اس لیے یہ کہنا کہ عرب اس جانور سے واقف ہی نہیں تھے غلط ہے۔ ایک مشکل یہ ہے کہ بہت سے ناقدین اور ان کے ساتھ شارحین بھی عرب کا تصور صرف ریگستان کا رکھتے ہیں کیونکہ ان کی نظر میں صرف ریگستان ہی ہے، اس کے جنوب میں یمن اور یمن سے ملحق تہامہ کی پٹی ہے جو سرسبز و شاداب ہے اور اس میں جنگل بھی ہیں ان سب کو حجاز و نجد کے رہنے والے دیکھا کرتے تھے رحلة الشتاء والصيف میں گرمیوں میں ان کا رخ انہی علاقوں کی طرف ہوا کرتا تھا، خود حجاز میں گھوڑے خچر گدھے گھاس اور چارہ کھانے والے جانور پائے جاتے تھے۔

حَتَّى وَضَعْتُ يَمِينِي لَا أُنَازِعُهُ   فِي كَفِّ ذِي نَقِمَاتٍ قِيلُهُ القِيلُ

لقد اقوم کے لفظ سے یہ شعر مربوط ہے، یعنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو مجرم کی حیثیت سے آیا اور اپنا داہنا ہاتھ آپ ؐ کے کف دست میں رکھ دیا جو مجھ سے ناراض تھے اور انتقام لینے کی پوری قدرت رکھتے تھے اور جن کا فرمان نافذ العمل ہے، قیلہ القیل کا ترجمہ ہے جن کی بات، حکم، فرمان نافذ العمل ہے، اردو محاورہ میں بھی کہتے ہیں

کہ فلاں کی بات بات ہے یعنی باد ہوائی نہیں ہے، ایسی بات نہیں ہے جس کا کوئی اثر نہ ہو بلکہ جو کہہ دیا وہ نافذ ہو کر رہا،

قیل کے معنی وہی ہیں جو قول کے ہیں قرآن مجید میں آیا ہے،

وقیله یارب إن هؤلاء قوم لا یؤمنون (الزخرف)

اور اس کا یہ قول کہ اے میرے رب یہ لوگ ایسی قوم ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔

ذی نقمات کا ناقص ترجمہ یہ کیا جاتا ہے، جو انتقام لینے والے ہیں، 'نقم' ناراضگی کو کہتے ہیں، قرآن مجید میں آیا ہے:

ومانقموا منهم الا أن یؤمنوا

بالله العزیز الحمید (البروج)

نقمات کا مفہوم یہ ہوتا کہ ایسی ذات جس کو میری طرف سے گزند پہونچا ہے اور وہ خفا ہیں؛ لا أنازعه کا مطلب ہے کہ میں آنحضرتؐ سے کوئی حجت کرنے نہیں آیا کہ وہ کچھ فرمائیں تو میں اس پر اعتراض کروں بلکہ صدق دل سے ان کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے، کعبؓ وہاں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! کعب بن زہیر کفر و بدگوئی سے توبہ کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہے اگر میں اس کو لے آؤں تو کیا آپ اس کی توبہ قبول فرمالیں گے، آپ نے فرمایا ہاں، اس نے عرض کیا میں کعب ہوں،

لَذَاكَ أَهْيَبُ عِنْدِي إِذْ أُكَلِّمُهُ   وَقِيلَ إِنَّكَ مَنْسُوبٌ وَمَسْئُولُ

لہٰذا وہ ذات گرامی جن سے میں مخاطب ہوں اور جب مجھ سے کہا جائے گا تم سے ایسی باتیں منسوب ہیں اور تم اس کے ذمہ دار ہو تو آپؐ میرے نزدیک زیادہ بارعب اور ہیبت و جلال رکھنے والے ہیں۔

مِنْ خَادِرٍ مِنْ لُيُوثِ الْأُسْدِ مَسْكَنُهُ   مِنْ بَطْنِ عَثَّرَ غِيلٌ دُونَهُ الْغِيلُ

اس شیر سے جو اپنے کچھار میں چھپا ہو اور وہ ان شیروں میں ہو جو عثر (نامی مقام) کے بھٹ میں ہو اور بھٹ درختوں کے جھنڈ کے پیچھے ہو اور اس کے پیچھے بھی ایک جھنڈ ہو۔

دونوں شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ خوف ناک شیر جو جنگلوں میں درختوں کے جھنڈ میں چھپا

ہوتا ہے اور جس کا رعب سارے نیستاں پر ہوتا ہے اس کا جتنا خوف ہو سکتا ہے اس سے زیادہ مجھ پر آنحضرتؐ کی ذات کا رعب ہے، اور ان سے تخاطب کے وقت مجھ پر ان کی ہیبت طاری ہے،

پہلے شعر میں أهيب عندی زیادہ بارعب میرے نزدیک، کہا اور دوسرے شعر میں کس سے زیادہ بارعب یعنی شیر سے، اور وہ شیر جو جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے اور اپنا رعب قائم رکھنے کے لیے جھاڑیوں میں چھپا رہتا ہے جس طرح بادشاہ عوام کی نظروں سے دور اپنے قصر میں رہتے ہیں، دوسرے شعر میں خادر جھاڑیوں میں رہنے والا، اسد، لیوث، لیث کی جمع ہے، اضافت ایک لفظ کی اس کے مرادف لفظ کی طرف ہے، جو کلام کو پرشکوہ بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے عین الشمس بولتے ہیں، اب آگے کے تین چار شعر میں اس شیر کے اوصاف بیان کریں گے جن سے زیادہ بارعب اور باہیبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

يَغْدُو فَيُلْحِمُ ضِرْغَامَيْنِ عَيْشُهُمَا   لَحْمٌ مِنَ الْقَوْمِ مَعْفُورٌ خَرَادِيلُ

وہ شیر جو صبح سویرے نکلتا ہے تاکہ اپنے دو شیر بچوں کو گوشت کی خوراک دے (کیونکہ) ان کی خوراک لوگوں کا گوشت ہے جو زمین پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھا ہوا ہو۔

شیر کی ہیبت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب وہ اپنے شیر بچوں کے لیے شکار کی تلاش میں نکلتا ہے، لحم من القوم قوم کے گوشت میں سے کچھ حصہ۔ کا مطلب آدمیوں کا گوشت لیا گیا ہے لیکن یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ جنگل میں بسنے والے جانور، معفور خرادیل زمین پر رکھے ہوئے ٹکڑے یا لوتھڑے، کیونکہ شیر بچے خود شکار نہیں کر سکتے تو ان کے لیے شکار کو چیر پھاڑ کر شیر نر رکھ دیا کرتا ہے۔

إِذَا يُسَاوِرُ قِرْنًا لَا يَحِلُّ لَهُ   أَنْ يَتْرُكَ الْقِرْنَ إِلَّا وَهُوَ مَجْدُولُ

ایسا شیر جو اپنے مقابل سے برسرپیکار ہو تو اس کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اس کو بغیر پچھاڑے ہوئے چھوڑ دے،

لا یحل له یعنی اس کو حلال نہیں ہوتا، یعنی اس کے شایان شان نہیں ہوتا مجدول جدالة سے بمعنی زمین، یعنی زمین پر پچھاڑا ہوا، ساور جھپٹنے یا حملہ کرنے میں مقابلہ کرنا، قرن، مقابل، ہمسر،

لہٰذا جب وہ ہمسر کو پچھاڑ کر رہتا ہے تو ایک کمزور مجرم کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔

مِنْهُ تَظَلُّ سِبَاعُ الْجَوِّ ضَامِرَةً وَلَا تَمَشَّى بِوَادِيهِ الْأَرَاجِيلُ

اس شیر کی دہشت سے دوسرے وادی کے شیروں کے پیٹ پچکے ہوئے رہتے ہیں، یعنی بھوکے رہ جاتے ہیں، اور اس کی وادی میں کسی کو چلنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

تمشی ٹہلنا، چلنا، فاعل اَراجیل جمع رجال جمع رجل پاؤں، یا شہوار کی ضد پاؤں پاؤں چلنے والا، اراجیل پیروں سے چلنے والے، سباع الجو اس وادی کے شکاری یا حملہ آور جانور، مطلب یہ کہ کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ اس کی موجودگی میں شکار کرے یا اس وادی میں ٹہلے پھرے،

وَلَا يَزَالُ بِوَادِيهِ أَخُو ثِقَةٍ مُطَرَّحَ الْبَزِّ وَالدِّرْسَانِ مَأْكُولُ

اور اس شیر کی وادی میں ہمیشہ بڑے بہادروں کے ہتھیار اور مستعمل لباس چبائے ہوئے پڑے رہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو بہادر لوگ یا شیر اس وادی میں آتے ہیں ان کو ہتھیار اور لباس سمیت شیر کھا جاتا ہے، پھر کپڑے اور ہتھیار اگل دیتا ہے وہ جا بجا پڑے ہوئے ملتے ہیں۔

بوادیہ کی خبر مقدم لایزال ہے، بوادیہ لایزال اُخوثقۃ والبز والدرسان مطرح ماکول اُخوثقۃ بہادر کو کہتے ہیں، گویا اس کی شجاعت کا وثوق ہے مطرح طرح سے پڑا ہوا، البز ہتھیار، درسان، درس کی جمع، پرانے پھٹے ہوئے کپڑے

إِنَّ الرَّسُولَ لَسَيْفٌ يُسْتَضَاءُ بِهِ مُهَنَّدٌ مِنْ سُيُوفِ اللّٰهِ مَسْلُولُ

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شمشیر ہیں جن سے روشنی حاصل کی جاتی ہے، وہ شمشیر جو ہندی لوہے کی بنی ہوئی ہے، اللہ کی تلوار جو نیام سے نکلی ہوئی ہے، اس شعر کی تشریح مقدمہ میں گذر چکی، یہی شعر اس قصیدہ میں مدح کا ہے، بقیہ چند شعر معذرت اور توبہ کے ہیں، اور اسی شعر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ردائے مبارک شاعرؓ کو مرحمت فرما دی، جس کی وجہ سے اس قصیدہ کا نام بردہ پڑ گیا۔

فِي فِتْيَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ قَالَ قَائِلُهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ لَمَّا أَسْلَمُوا زُولُوا

وہ قریش کے جوانوں میں ہیں، یا قریش کی جماعت میں ہیں کہ جب وہ مسلمان ہوئے تو ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یہاں سے کوچ کرو۔

فتیۃ، فتی کی جمع ہے جس کے معنی جوان کے ہیں، شریف اور سخی کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل ہے، اور فتیۃ کے لفظ سے مطلق جماعت بھی مراد ہوتی ہے، قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ جس کے مورث اعلیٰ فہر بن مالک بن النضر تھے، چونکہ اکثر مہاجر اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ایمان لانے والے کا قریش سے حوالہ دیا گیا، بطن مکۃ وادیٔ مکہ، زولوا امر ہے زال یزول ہٹنا، کوچ کرنا، چلے جانا، مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے ایک گل سرسبد ہیں۔ جب لوگ آپ پر ایمان لے آئے تو انہی اہل ایمان میں سے ایک نے کہا کہ اب یہاں سے ہجرت اختیار کر لیجیے، یہ کہنے والے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے، یا حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، روایت ہے کہ جب حضرت کعبؓ نے یہ شعر پڑھا تو تائید و تحسین کی نظر سے آپ نے دوسرے صحابہ کی طرف دیکھا کہ کتنی سچی بات اس نے کہی۔

زَالُوا فَمَا زَالَ أَنْكَاسٌ وَلَا كُشُفٌ عِنْدَ اللِّقَاءِ وَلَا مِيلٌ مَعَازِيلُ

یہ لوگ ہجرت کے لیے کوچ کر گئے، لیکن ان لوگوں نے ہجرت نہیں کی جو کمزور تھے، مقابلۂ دشمن کے وقت جن کے پاس ڈھال نہ تھی اور جن کے پاس تلواریں نہ تھیں، نہتے بے ہتھیار کے تھے۔

مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے ہجرت کی تو آپؐ کے ساتھ جو لوگ تھے وہ سب بہادر، ڈھال سے آراستہ تلوار بستہ تھے، بے ڈھال اور تلوار کے نہتے اور کمزور نہ تھے۔

انکاس، نکس کی جمع ہے کمزور افراد، کشف جمع اَکشف کھلے سر والے، جن کے پاس ڈھال نہ ہو، اللقاء سے مراد دشمن سے مڈبھیڑ، میل جمع اُمیل جن کے پاس تلوار نہ ہو، معازیل جن کے پاس کوئی ہتھیار نہ ہو، نہتا۔

شُمُّ الْعَرَانِينِ أَبْطَالٌ لَبُوسُهُمُ مِنْ نَسْجِ دَاوُدَ فِي الْهَيْجَا سَرَابِيلُ

بڑی ناک والے، جنگ کے مرد میدان، معرکہ میں ان کا لباس حضرت داؤد کا "خود" اور "زرہ" ہے،

اس شعر میں صحابۂ کرام کی تعریف ہے کہ وہ باعزت، بلند ہمت اور شریف خاندانی لوگ

ہیں جن کی علامت ان کی لمبی ناکیں ہیں، حضرت داؤد کی زرہ معرکہ کے وقت پہنے رہتے ہیں،
حضرت داؤد کی زرہ مثال کے طور پہ بیان کی جاتی تھی،

بِيْضٌ سَوَابِغُ قَدْ شُكَّتْ لَهَا حَلَقٌ كَأَنَّهَا حَلَقُ الْقَفْعَاءِ مَجْدُوْلُ

(ان صحابہ کرام کے جسم پر جو زرہ ہے ہیں) وہ صاف اور چمکدار ہیں، پورے جسم کو ڈھانپنے والی ہیں،
ان کے حلقے ایک دوسرے سے پیوست ہیں گویا کہ قفعاء نامی پودے کے حلقوں کی طرح
گھتے ہوئے ہیں۔

بیض صاف وچمکدار (أبیض کی جمع) سوابغ جمع سابغة وہ لباس یا زرہ جو
پورے جسم کو ڈھک دے، شک کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز میں ملکر مخلوط ہوجانا، یہاں
مطلب یہ ہے کہ زرہ کے حلقے نزدیک نزدیک اور آپس میں گھتے ہوئے ہیں، قفعاء ایک
پودا ہوتا تھا جس کی بیل ہوتی تھی، مجدول خوب مضبوطی سے گھتا ہوا،

لَا يَفْرَحُوْنَ إِذَا نَالَتْ رِمَاحُهُمُ قَوْمًا وَلَيْسُوا مَجَازِيعًا إِذَا نِيْلُوا

(صحابہ کرام) کے نیزے اگر نشانے پر لگ جاتے ہیں یعنی دشمن پر وار کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو گھمنڈ
نہیں کرتے۔ اور اگر ان پر دشمن کا وار چل جاتا ہے تو جزع فزع نہیں کرتے،

مجازیع جزع فزع کرنے والے، یعنی مصیبت پر غم وملال کا اظہار کرنے والے، مطلب
یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بلند ہمت اور بڑے طرف کے لوگ ہیں، فرح کے معنی خوش ہونا
یا گھمنڈ کرنا، قرآن کریم میں دونوں معنوں میں یہ لفظ آتا ہے۔

يَمْشُوْنَ مَشْيَ الزُّهْرِ يَعْصِمُهُمْ ضَرْبٌ إِذَا عَرَّدَ السُّوْدُ التَّنَابِيْلُ

وہ جب میدان جنگ میں چلتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ سفید قسم کے اونٹ کی چال سے چل رہے ہیں
اور ان کو بچانے والی شئے ان کے حملے ہوتے ہیں، ایسے گھمسان معرکہ کے موقعہ پر جب کہ کوتاہ قامت
کالی رنگت والے لوگ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

الزھر کھلی رنگت والا، مجازا گورا، سفید، عرّد فرار ہوا، سود، اسود کی
جمع، سیاہ رنگت والے، تنابیل، تنبال کی جمع، یعنی کوتاہ قامت۔
مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام بلند کردار، اور جنگ کے مرد میدان ہیں، جس طرح قیمتی سفید

رنگت والے اونٹ میدان جنگ میں قطار اور پامردی سے نکلتے ہیں اسی طرح یہ لوگ نکلتے ہیں، اپنے
بچاؤ کا طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ خود حملہ آور ہوجاتے ہیں اور ایسے معرکہ میں جب کہ کالی رنگت والے
کوتاہ قد بھاگ کھڑے ہوں یہ اپنی جگہ سے ٹلتے نہیں۔

www.facebook.com/Naat.Research.Centre
www.sabih-rehmani.com/books

قصیدہ بردہ

آپ نے سنا ہوگا کہ 'تاج محل' دنیا کے سات عجائب میں ایک عجوبہ ہے' علمی وادبی دنیا میں بھی اگر عجائب تلاش کیے جائیں تو علامہ بوصیری کا 'قصیدۂ بردہ' ایک عجوبہ قرار پائے گا۔ زمانہ گزرتا جاتا ہے اور اس کی شہرت بڑھتی جاتی ہے، بار بار پڑھا جاتا ہے مگر پامال ہونا کیا معنیٰ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تازگی میں اضافہ ہو رہا ہے، فنی اور علمی طور پر جائزہ لیجیے تو سمجھ میں نہیں آئے گا کہ وہ بجلی کی طاقت اور مقناطیسی اثر کس وجہ سے ہے۔ اس سے بدرجہا اچھے اشعار کہے جا چکے ہیں، ایسے سیکڑوں نعتیہ قصیدے ہیں جن کے الفاظ منتخب جیسے چمکتے ہوئے موتی ہوں، بندش کی چستی ایسی جیسے حسین و دلفریب لعل وجواہر سے مرصع ہار ہوں مگر ان میں وہ کشش نہیں جو اس قصیدہ میں ہے، وہ قصیدے ایک دو بار پڑھے گئے اور کتابوں کی زینت بن کر رہ گئے مگر قصیدۂ بردہ ہے کہ اس کی ہر زمانہ میں شرحیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں' اس کے بے شمار منظوم ترجمے بھی ہو چکے ہیں اور شرحیں بھی لکھی گئی ہیں اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے'۔

معلوم ہوا فن اور چیز ہے ــــ اور قبولیت اور شئ ہے ــــ یہ قبولیت کا معاملہ ہے ــــ یہ قصیدہ وہاں قبول ہو چکا ہے ــــ جس بارگاہ کے لیے کہا گیا تھا:

ہر کہ سلطاں مرید او باشد ۔۔۔ گر ہمہ بد کند، نکو باشد
وانکہ در پادشہ بَیَندازَد ۔۔۔ کس از خیلِ خانہ ننوازد

(بادشاہ جس کو پسند کرلے اگر اس میں ساری برائیاں ہوں تو وہ اچھا ہے، اور جس کو شاہ، نظر انداز کر دے تو پھر اس کو اپنے گھر والے بھی نہیں پوچھتے)

قصیدۂ بردہ کو شاہِ شاہاں، سلطان عالمیاں، سرتاج انبیاء نے پسند فرمالیا، اس کے بعد کسی فنّی تجزیہ اور تنقید و تبصرہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی، آئندہ صفحات میں آپ اس قصیدہ کی تاریخ، مصنف کے حالات زندگی اور قصیدہ سے متعلق معلومات پڑھیں گے، پھر اصل قصیدہ مع ترجمہ و شرح کے پیش کیا جائے گا۔

مصنف قصیدہ بردہ:

علامہ بوصیری جن کا پورا نام محمد بن سعید ہے، ساتویں صدی ہجری کے ایک مصری شاعر اور طریقۂ شاذلیہ کے صاحبِ نسبت واجازت صوفی بزرگ تھے۔ مصر کے علاقہ بنی سویف میں ابوصیر اُن کا دادیہال اور دلاص نانیہال تھا، ابوصیری اسی گاؤں کی طرف نسبت ہے، جو مخفف ہوکر ابوصیری سے بوصیری رہ گیا۔

ان کی ولادت دلاص میں ۶۰۸ھ اور وفات اسکندریہ میں ۶۹۶ھ میں ہوئی، نعت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی شاعری کا موضوع تھا، "قصیدہ بردہ" کے علاوہ بھی ان کی متعدد نعتیں ہیں، خاص طور سے ان کا 'قصیدۂ ہمزیہ' بہت مقبول عام قصیدہ ہے، اس کے علاوہ 'قصیدہ بانت سعاد' کی زمین میں ایک طویل قصیدہ علامہ نبہانی نے نقل کیا ہے، جس کا مطلع ہے:

إلىٰ مَتىٰ انْتَ باللَّذّاتِ مَشْغُولُ
وَانْتَ عَنْ كُلِّ مَا قَدَّمْتَ مَسْئُولُ

یعنی (تم کب تک لذت اندوزی میں مشغول رہو گے، حالانکہ جو کچھ اس دنیا میں کروگے اس کے تنہا ذمہ دار تم ہی ہو گے۔)

ان کے اشعار کا مجموعہ مطبوعہ اور قلمی دونوں موجود ہے، پورا دیوان نعتیہ کلام پر مشتمل ہے، ہر قصیدہ روایتی تشبیب سے شروع ہوتا ہے، اور ہر حرف تہجی میں ان کا قصیدہ نعتیہ موجود ہے۔

صاحب "فوات الوفیات" نے ان کا ایک اور قصیدہ نقل کیا ہے، جس میں علامۂ بوصیری نے

"شکوہ" بہ بارگاہ رب العالمین پیش کیا ہے، مصر کی اجتماعی حالت پر اس قصیدہ سے روشنی پڑتی ہے، علماء کی بے حسی، حکام کی خدا سے بے خوفی اور جرأت، اہل کاروں کی رشوت خوری، محرمات کا عام ہونا، فرائض کی ادائگی سے جان چرانا، اس قصیدہ کے مضامین ہیں، جو بہت لطیف انداز میں طنز کے پیرایہ میں نظم کیے گئے ہیں، اور آخر میں اللہ سے فریاد کی ہے کہ وہی اصلاح فرمائے۔ اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

نَقَدَتْ طَوَائِفَ الْمُسْتَخْدِمِينَا
فَلَمْ أَرَ فِيهِمْ حُرًّا أَمِينَا

(سرکاری ملازمین کے تمام گروہوں کو اچھی طرح سے جانچ لیا، مجھے ان میں کوئی روشن ضمیر، صاحب امانت و دیانت نہیں دکھائی دیا۔)

لیکن ان کی شہرت و مقبولیت کا سبب "قصیدۂ بردہ" ہے، جس کے متعلق یہ روایت ہے کہ ان کے جسم کے نصف حصہ پر فالج گر گیا تھا، اس حال میں انھوں نے یہ لکھا تھا، خواب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے، اور آپؐ نے اُن پر اپنی چادر ڈالدی، اور دست مبارک ان کے رخسار اور سر پر پھیرا، جب بیدار ہوئے تو اپنے فالج شدہ حصۂ جسم میں نشاط محسوس کیا اور فالج کا اثر ختم ہوگیا، صبح کو کہیں جارہے تھے کہ کوئی فقیر ملا، اس نے کہا کہ بوصیری! وہ قصیدہ لاؤ جو تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں کہا ہے، بوصیری نے اس قصیدہ کا حال کسی کو نہیں بتایا تھا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزہ پر یقین تھا، اس لیے انھوں نے اس فقیر سے یہ بات سن کر تعجب کا اظہار نہیں کیا کہ تم کو کیسے معلوم ہوا، مگر خود اس فقیر نے کہا کہ میں نے رات دیکھا کہ تم آنحضرتؐ کی مجلس شریف میں اپنا قصیدہ سنا رہے ہو، اور حضورؐ پر وجد کی کیفیت، طاری ہے، چنانچہ اس قصیدہ کی شہرت اس فقیر کے ذریعہ ہوئی، اس قصیدہ کا عنوان علامہ بوصیری نے "الکواکب الدریۃ فی مدح خیر البریۃ" رکھا تھا، لیکن اپنی مقبولیت کی وجہ سے "قصیدۂ بردہ" کے نام سے مشہور ہوگیا، بعض لوگوں نے کعب بن زہیر کے "قصیدۂ بردہ" اور اس قصیدہ کے درمیان تمیز کرنے کے لیے بوصیری کے قصیدہ کو "بردۂ منامیہ" بھی کہا ہے، کیونکہ بوصیریؒ کو عالم رؤیا میں بردہ مرحمت فرمایا گیا تھا، عوام میں مشہور ہے کہ شیخ بوصیریؒ جب خواب سے بیدار ہوئے تو انھوں نے بردۂ مبارکہ

موجود پایا جو خواب میں ان کو مرحمت فرمایا گیا تھا، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اور نہ کسی معتبر تاریخ میں کہی گئی ہے، لیکن جو بات صحیح ہے وہ یہ کہ یہ قصیدہ جس درجہ مقبول ہوا اس درجہ قصیدہ "بانت سعاد" کو بھی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی، لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوچکا ہے، اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی نئی شرح لکھتا رہتا ہے، سیکڑوں (بلامبالغہ) قصیدے اس زمین پر کہے جاچکے، پچاسوں تضمینیں اور مشطر، مخمس، مسدس، مسبع اور معشر کہے گئے۔

اس قصیدہ کے عرب شارحین کی فہرست میں حسب ذیل نمایاں نام ہیں:

۱۔ ابن الصائغ م ۷۷۶ھ
۲۔ علی بن محمد قلصادی م ۸۹۱ھ
۳۔ شہاب الدین ابن العماد، م ۸۰۸ھ
۴۔ علاؤ الدین بسطامی م ۸۷۵ھ
۵۔ یوسف بن ابی اللطف القدسی م ۱۰۰۰ھ
۶۔ یوسف البسطامی۔ نویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں، سن وفات مذکور نہیں ہے۔
۷۔ ملا علی قاری م ۱۰۱۴ھ
۸۔ شیخ زادہ محی الدین۔ تاریخ وفات لامعلوم، لیکن ان کی شرح کے قدیم نسخہ پر تاریخ تصنیف ۹۴۹ھ مذکور ہے۔
۹۔ جلال الدین المحلی م ۸۶۴ھ (تفسیر جلالین کے ایک حصہ کے مصنف)
۱۰۔ محمد بن احمد المرزوقی م ۸۸۱ھ (شارح حماسہ)
۱۱۔ عبدالحق بن عبدالفتاح (بارہویں صدی ہجری)
۱۲۔ محمد المصری (گیارہویں صدی ہجری)
۱۳۔ زکریا الانصاری م ۹۲۶ھ
۱۴۔ عمر الخربوتی (تیرہویں صدی ہجری)
۱۵۔ علامہ قسطلانی (شارح بخاری) م ۹۲۳ھ

۱۶۔ محمد بن مصطفیٰ المورنی (تیرہویں صدی ہجری)

۱۷۔ محمد عثمان المرغنی (تیرہویں صدی ہجری)

۱۸۔ شیخ حسن العدوی الحمزاوی ۱۳۰۳ھ

۱۹۔ الباجوری ۱۲۷۶ھ

اس کے علاوہ دارالکتب المصریہ میں متعدد شرحیں ہیں، جن کے مصنفین کا نام درج نہیں ہے، اس کی تضمین کرنے والوں میں سے ایک شیخ قاسم ہیں (جن کا ترجمۂ حیات معلوم نہیں۔)

تضمین کا مطلب عربی میں یہ ہے کہ ہر مصرعہ کے جزء اوّل یا آخری جزء کو تبدیل کر دیا جائے:

أَمِنْ تَذَكُّرِ أَوْطَانٍ عَلَىٰ عَلَمٍ
أَمْ مِنْ تَفَقُّدِ جِيْرَانٍ بِذِي سَلَمٍ
مَزَجْتَ دَمْعًا جَرَىٰ مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمٍ
يَجْرِي عَلَىٰ وَجَنَةٍ مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمٍ

(کیا ٹیلوں پر اپنے گھروں کی یاد میں ــــ یا ذو سلم کے پڑوسیوں کی تلاش میں۔)
(میں نے اس آنسو کو جو بارش کے قطروں کی طرح رخسار پر بہتا ہے دیدہ سے نکلنے والے خون سے ملا دیا۔)

اس کی تشطیر (ہر مصرع پر ایک گرہ لگانا) کرنے والوں میں ایک احمد بن شرقاوی[1] م ۱۲۵۰ھ ہیں فرماتے ہیں:

أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيْرَانٍ بِذِي سَلَمٍ
تَصَبَّبَ الدَّمْعُ يَجْرِي عَالِيَ الدِّيَمِ
أَمِنْ تَفَتُّتِ قَلْبٍ فِي الْحَشَا شَغَفًا
مَزَجْتَ دَمْعًا جَرَىٰ مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمٍ

(کیا ذو سلم کے پڑوسیوں کی یاد میں آنسو تیز بارش کی طرح گر رہے ہیں، یا وارفتگیِ عشق میں پہلو میں دل کے ٹکڑوں کی وجہ سے تم نے آنسوؤں کو جو دیدہ سے بہ رہے

[1] مصر کے بہت بڑے صوفی بزرگ تھے، قادری نسبت بھی رکھتے تھے، ان کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

ہیں خون آلود کر دیا ہے۔)

اور احمد بن عبدالوہاب الجرجاوی م ۱۲۵۴ھ نے بھی گرہ لگائی ہے:

أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيْرَانٍ بِذِي سَلَمٍ
أَصْبَحْتَ ذَا خَلَدٍ بِالْوَجْدِ مُصْطَلِمٍ

(کیا ذو سلم کے پڑوسیوں کی یاد میں عشق سے تمہارا دل ویران ہو گیا ہے۔)

احمد بن عثمان العوامی کی گرہوں کے دو شعر یہ ہیں:

أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيْرَانٍ بِذِي سَلَمٍ
جَزَمْتَ أَنَّكَ مَقْصُوْرٌ عَلَى الْأَلَمِ
وَعِنْدَ مَا هَاجَتِ الذِّكْرَىٰ وَلَوْعَتُهَا
مَزَجْتَ دَمْعًا جَرَىٰ مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمٍ

(کیا ذو سلم کی پڑوسیوں کی یاد میں، تم نے یقین کر لیا ہے کہ تم ہمیشہ کے لیے غم زدہ رہو گے، اور جب یاد اور یاد کی تپش ابھری تو تم نے آنسوؤں کو خون آلود کر دیا۔)

رمضان حلاوہ مصری م ۱۳۰۱ھ کہتے ہیں:

أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيْرَانٍ بِذِي سَلَمٍ
لَبِسْتَ ثَوْبًا مِنَ الْأَشْوَاقِ وَالْأَلَمِ
أَمِنْ عُيُوْنِ ظِبَاءٍ بِالْعَقِيْقِ بَدَتْ
مَزَجْتَ دَمْعًا جَرَىٰ مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمٍ

(کیا ذو سلم کے پڑوسیوں کی یاد میں۔ تم نے درد و شوق کا لباس پہن رکھا ہے، یا وادی عقیق کی ہرنیوں کی آنکھوں سے کھل گیا ہے کہ تم نے آنسوؤں کو خون آلود کر دیا ہے۔)

ان کے علاوہ ابوالہدی الصیادی[1]، احمد الحفظی، عبدالرحیم الجرجاوی، محمد فرغلی الطہطاوی کی تضمینوں کے نمونے بھی ڈاکٹر زکی مبارک نے اپنے مجموعہ میں نقل کیے ہیں:

---

[1] سلطان عبدالحمید خاں کے شیخ و مرشد، حلب کے رہنے والے تھے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

مصر کے شاہی دور کے ایک وزیر عبدالعزیز بک محمد کی تضمین کا مطلع ہے :

أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيرَانٍ بِذِي سَلَمٍ
فَاضَتْ شُئُونُكَ مُلْتَاعًا لِبَيْنِهِمُ
أَمْ مِنْ فُؤَادِكَ مَكْلُومًا لِوَحْشَتِهِمْ
مَزَجْتَ دَمْعًا جَرَى مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمِ

(کیا ذوسلم کے پڑوسیوں کی یاد میں تمہاری آنکھیں ان کے فراق میں جلتے ہوئے آنسو بہا رہی ہیں۔ یا رنج جدائی میں زخمی دل کی وجہ سے تم نے آنسوؤں کو خون آلود کرلیا ہے)

جن لوگوں نے اس قصیدہ کی تخمیس کی ہے (یعنی ہر شعر پر تین مصرعے لگائے ہیں) اور جو دارالکتب المصریہ میں محفوظ ہیں، وہ بقول زکی مبارک ۶۹ ہیں۔

اس کی تسبیع کرنے والوں (یعنی ہر شعر پر پانچ مصرعوں کا اضافہ کیا ہے) میں شہاب الدین احمد بن عبداللہ المکی اور محمد المصری ہیں، احمد بن عبداللہ مکی کے تسبیع میں یہ اہتمام ہے کہ ہر بند کا پہلا لفظ اللہ ہے، اور محمد المصری کے ہر بند کا پہلا لفظ محمد ہے، مثلاً احمد بن عبداللہ مکی فرماتے ہیں :

اَللّٰهُ يَعْلَمُ كَمْ بِالْقَلْبِ مِنْ أَلَمِ
وَمِنْ غَرَامٍ بِأَحْشَائِي وَمِنْ سَقَمِ
عَلَى فِرَاقِ فَرِيقٍ حَلَّ فِي الْحَرَمِ
فَقُلْتُ لَمَّا هَمَى دَمْعِي بِمُنْسَجِمِ
عَلَى الْعَقِيقِ عَقِيقًا غَيْرَ مُنْسَجِمِ
أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيرَانٍ بِذِي سَلَمٍ
مَزَجْتَ دَمْعًا جَرَى مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمِ

(اللہ ہی جانتا ہے کہ دل میں کس درجہ الم ہے، کتنا عشق ہے، کس درجہ پہلو میں دل بیتاب ہے ـــــ ان لوگوں کی جدائی میں، جو ارض حرم تک آگئے ہیں، جب آنسو کی بارش ہونے لگی تو میں نے کہا، وادی عقیق میں ایک عقیق (ایک قیمتی پتھر مثل لعل وجواہر) ہے جس کا رنگ میلا نہیں ہوتا۔ اس کی یاد میں یا ذوسلم کے پڑوسیوں

کی یاد میں، تم نے دیدۂ نمناک سے بہنے والے آنسوؤں کو خون آلود کرلیا ہے ؟)

محمد مصری کی تسبیع، (یعنی پانچ مصرعے بڑھاکر ہر بند کو سات مصرع کا بند بنانا) جس کے ہر مطلع کا ابتدا محمد سے ہوتی ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے :

مُحَمَّدٌ جَاءَ بِالْآيَاتِ وَالْحِكَمِ
مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا لِجُمْلَةِ الْأُمَمِ

(محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نشانیاں اور حکمت لے کر آئے، خوشخبری دینے والے اور تمام قوموں کو خطرہ سے آگاہ کرنے والے)

تعشیر (یعنی ہر شعر پر آٹھ مصرعے بڑھائے گئے) کرنے والے زیادہ نہیں ہیں ـــــ دارالکتب المصریہ میں ایک قلمی تعشیر ہے جس کے مصنف کا نام پتہ معلوم نہیں۔ (زکی مبارک)

مصر کے مشہور شاعر احمد شوقی نے بھی اس کا معارضہ کیا ہے، جس کا نام "نہج البردہ" رکھا ہے، اس کا مطلع ہے :

رِيمٌ عَلَى الْقَاعِ بَيْنَ الْبَانِ وَالْعَلَمِ
أَحَلَّ سَفْكَ دَمِي فِي الْأَشْهُرِ الْحُرُمِ

(ہرنیاں جو بان کے درختوں اور ٹیلوں کے درمیان ہیں، انھوں نے حرمت والے مہینوں میں میرا خون بہانا جائز کرلیا۔)

معاصرین میں شیخ احمد الحملاوی مرحوم ازہر کے ایک مدرس تھے، انھوں نے "منہاج البردہ" کے عنوان سے معارضہ کیا ہے، جس کا مطلع یہ ہے :

يَا غَافِرَ الذَّنْبِ مِنْ جُودٍ وَمِنْ كَرَمِ
وَقَابِلَ التَّوْبِ مِنْ جَانٍ وَمُحْتَرِمِ
وَمُسْبِلَ السِّتْرِ إِحْسَانًا وَمَرْحَمَةً
عَلَى الطُّغَاةِ بِفَيْضِ الْفَضْلِ وَالْكَرَمِ
اِقْبَلْ مَتَابِي وَاغْفِرْ لِمَا جَنَتْهُ يَدِي
وَاسْتُرْ عُيُوبِي وَبَاعِدْنِي عَنِ التُّهَمِ

(اے گناہوں کو اپنے جود وکرم سے بخشنے والے اور مجرم و نکوکار دونوں کی توبہ قبول کرنے والے، اور اپنے احسان و رحم سے پردہ پوشی فرمانے والے، نافرمانوں کو احسان و بخشش کے بھاؤ سے درگزر کرنے والے — میری توبہ قبول فرمالے، اور میرے ہاتھوں سے جو معصیت سرزد ہوئی ہے ان کو بخش دے، اور میرے عیوب پر پردہ ڈال دے اور تہمتوں سے دور رکھ۔)

کچھ لوگوں نے قافیے بدل کر اسی زمین پر اس مضمون کو دوسرے الفاظ میں نظم کیا ہے جن میں ابن جابر الاندلسی اور ابو جعفر احمد بن یوسف الغرناطی کے نام مشہور ہیں، پھر ان کے قصیدوں کی شرح کرنے والوں اور تخمیس و تسدیس (یعنی دو شعر بڑھائے ہوں) کرنے والوں کے ناموں کی فہرست طویل ہے۔ راقم الحروف کے پاس باجوری کی شرح ہے، جس میں ہر شعر کے فوائد مذکور ہیں، مثلاً اس قصیدہ کے پہلے تین شعر کو کاغذ پر لکھ کر سرہانے رکھا جائے تو بخار دور ہو جائے گا، اور فلاں شعر کے ورد سے روزی بڑھے گی، اور فلاں شعر کو لکھ کر گھول کر پی لیا جائے تو اس سے بیماریاں دور ہوں گی۔ گویا اس قصیدہ کا ہر شعر تعویذ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی کے علاوہ اس قصیدہ کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں، زکی مبارک نے بعض فرنچ، جرمن ترجموں کا حوالہ دیا ہے۔

قصیدہ کے مضامین:

اس قصیدہ کے ایک سو بیاسی (۱۸۲) شعر ہیں، علامہ بوصیریؒ نے غالباً اپنی نعت کے لیے مشہور صوفی شاعر ابن الفارض کی زمین پسند کی ہے، جن کے قصیدہ (الٰہیات) کا مطلع یہ ہے:

هَلْ نَارُ لَيْلَىٰ بَدَتْ لَيْلاً بِذِي سَلَمِ   أَمْ بَارِقٌ لَاحَ فِي الزَّوْرَاءِ وَالْعَلَمِ

أَرْوَاحُ نُعْمَانَ هَلَّا نَسْمَةٌ سَحَرًا   وَمَاءُ وَجْرَةَ عَلَّا نَهْلَةٍ بِفَمِ

(کیا لیلیٰ (کے گھر جلائی جانے والی) آگ رات کو ذوسلم میں ظاہر ہوئی یا کوئی بجلی ہے، جو زوراء اور علم میں چمکی۔)

(کیا نعمان (نامی پھول) کی پتیاں نسیم سحر بن کر پھیل گئیں یا وجرہ کا پانی آبِ حیات بن کر لبوں تک آگیا۔)

بوصیریؒ کی نعت کا مطلع ہے:

أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيرَانٍ بِذِي سَلَمِ   مَزَجْتَ دَمْعًا جَرَىٰ مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمِ

أَمْ هَبَّتِ الرِّيحُ مِنْ تِلْقَاءِ كَاظِمَةٍ   وَأَوْمَضَ الْبَرْقُ فِي الظَّلْمَاءِ مِنْ إِضَمِ

(۱۔ تیری آنکھوں سے یہ خون آلود آنسو کیوں رواں ہیں، کیا ذوسلم کے پڑوسی یاد آرہے ہیں؟)

(۲۔ یا کاظمہ سے کوئی ہوا چلی ہے، یا تاریکی میں اضم کی پہاڑی سے کوئی بجلی چمکتی دیکھ لی ہے؟)

ان دونوں مطلعوں میں ذوسلم کی وادی کا اشارہ: "ھبوب الریح" (کسی خاص جہت کی ہوا کا چلنا) اور "ایماض البرق" (بجلی کا چمکنا) لفظی لحاظ سے مشترک ہے۔

ابن الفارض کا شعر ہے:

يَا لَائِمًا لَامَنِي فِي حُبِّهِمْ سَفَهًا   كُفَّ الْمَلَامَ فَلَوْ أَحْبَبْتَ لَمْ تَلُمِ

(ان کی محبت میں مجھ پر ملامت کرنے والے نادان! اپنی ملامت بند کر، اگر تجھے بھی محبت سے واسطہ پڑتا تو ملامت نہ کرتا۔)

بوصیریؒ نے اپنی نعت میں کہا:

يَا لَائِمِي فِي الْهَوَىٰ الْعُذْرِيِّ مَعْذِرَةً مِنِّي إِلَيْكَ، وَلَوْ أَنْصَفْتَ لَمْ تَلُمِ

(اے پاک محبت پر مجھے ملامت کرنے والے، میری معذرت قبول کر اگر تو انصاف کرتا تو ملامت نہ کرتا۔)

ابن الفارض کا شعر ہے:

طَوْعًا لِقَاضٍ أَتَىٰ فِي حُكْمِهِ عَجَبًا   أَفْتَىٰ بِسَفْكِ دَمِي فِي الْحِلِّ وَالْحَرَمِ

أَصَمُّ، لَمْ يَسْمَعِ الشَّكْوَىٰ وَأَبْكَمُ لَمْ   يُحِرْ جَوَابًا وَعَنْ حَالِ الشَّوْقِ عَمِي

(۱۔ اس قاضی کا فیصلہ سر آنکھوں پر جس نے عجیب فیصلہ دیا ہے، میرے خون کے بہانے کا حکم دے دیا حل اور حرم میں۔)

(۲۔ بہرا ہے، شکایت نہیں سنتا، گونگا ہے، جواب نہیں دے سکتا، مشتاق کے حالِ زار کو دیکھ نہیں سکتا۔)

بوصیریؒ نے اسی مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے :

عَرَّتْكَ حَالِي لَا سِرِّي بِمُسْتَتِرٍ عَنِ الْوُشَاةِ وَلَا دَائِي بِمُنْسَجِمِ
مَحَّضْتَنِي النُّصْحَ لٰكِنْ لَسْتُ أَسْمَعُهُ إِنَّ الْمُحِبَّ عَنِ الْعُذَّالِ فِي صَمَمِ

(گزشتہ شعر سے اس شعر کے معنی مربوط ہیں) اے ملاقات کرنے والے تجھ پر میرا حال ظاہر ہے اور چغل خوروں سے میرا کوئی راز بھی چھپا ہوا نہیں ہے، اور نہ میری بیماری ایسی ہے کہ ختم ہو جائے۔)

(۲۔ بلاشبہ تو نے بہت اخلاص کے ساتھ محض ہمدردی میں میری خیر خواہی کی کہ مجھے ترک محبت کی نصیحت کی لیکن تجھے معلوم ہے کہ عاشق ناصحوں کی طرف سے بہرا ہو جاتا ہے۔)

علامہ بوصیریؒ نے ابن الفارض کے قصیدہ سے زمین اور چند اشارے اور استعارے ضرور لیے ہیں، لیکن آگے چل کر وہ اپنی ڈگر پر چلنے لگے ہیں۔ ابن الفارض صوفی شاعر تھے، اور ان کا کلام حُبِّ الٰہی اور تصوف کے نازک مضامین پر مشتمل ہے، بوصیریؒ کا موضوع ذاتِ نبوی اور حبِّ نبوی ہے، ان دونوں مضامین میں جو قربت ہے، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

اس قصیدہ کے مضامین کی ترتیب یہ ہے :

۱۔ تشبیب (جس کے بارے میں پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، مزید نمونہ کے کلام کے سلسلہ میں عرض کیا جائے گا۔)

۲۔ نفس کی فریب کاریوں سے آگاہی۔

۳۔ گریز، مدح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔

۴۔ ولادت نبوی اور معجزات کا ذکر۔

۵۔ قرآن کریم، اسراء و معراج اور جہاد کا ذکر۔

۶۔ توسّل اور مناجات۔

اس قصیدہ کی اردو میں متعدد شرحیں اور ترجمے موجود ہیں، اس لیے نمونے کے طور پر صرف ابتدائی ۲۳ شعروں کا ترجمہ پیش خدمت ہے، جو اس قصیدہ کے اسلوب کا اندازہ کرنے کے لیے کافی

ہوگا۔

أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيرَانٍ بِذِي سَلَمٍ مَزَجْتَ دَمْعًا جَرَى مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمِ
أَمْ هَبَّتِ الرِّيحُ مِنْ تِلْقَاءِ كَاظِمَةٍ وَأَوْمَضَ الْبَرْقُ فِي الظَّلْمَاءِ مِنْ أَضَمِ

شاعر اپنی ذات کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے :

(۱۔ تیری آنکھوں سے یہ خون آلود آنسو کیوں رواں ہیں! کیا ذوسلم[1] کے پڑوسی یاد آ رہے ہیں؟)

(۲۔ یا کاظمہ[2] کی جانب سے کوئی ہوا چلی ہے، یا تاریکی میں اضم[3] کی پہاڑی سے کوئی بجلی چمکتی دیکھ لی ہے؟)

امام بوصیریؒ نے اس قصیدہ کی ابتدا قدیم عربی شاعری کے روایتی انداز سے کی ہے، مگر نعت کے مضمون کی نزاکت اور مقام رسالت کا جمال و جلال ان کے پیش نظر تھا، اس لیے اس مضمون کو طول نہیں دیا، صرف مطلع کے ان دو شعروں میں اس قدیم اسلوب کی پیروی کی ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ کسی خیالی محبوب اور اس کے کاکل و عارض کا ذکر نہیں کیا، جیسا کہ جاہل شعراء کا دستور تھا، یا جیسا کہ آپ قصیدۂ "بانت سعاد" میں دیکھتے ہیں، بلکہ سرزمین حجاز کے سمت میں واقع چند مقامات کو یاد کیا جہاں سے کسی زمانے میں حج و زیارت کے لیے جانے والے کارواں گزرا کرتے تھے۔

بعض لوگوں کے خیال میں "تشبیب" کے لفظی معنی ہیں "آنچ تیز کرنا" (نہ کہ ایام شباب کا یاد کرنا، مادہ کے لحاظ سے دونوں مفہوم کی گنجائش ہے) قدیم شعراء کا اس سے مطلب یہ ہوتا تھا کہ اصل مضمون کو بیان کرنے کے لیے محبوب کو یاد دلانے والے اور اس سے نسبت رکھنے والے مقامات کا

---

[1] بصرہ سے مکہ آنے والے راستہ میں ملنے والی ایک وادی ہے، ملاحظہ ہو "جزیرۃ العرب" از مولانا رابع الحسنی حصہ اول طبع لکھنؤ ۱۹۶۲ء ص ۲۲۸۔

[2] بحرین اور بصرہ کا ایک ساحلی راستہ جس کے اطراف کی وادیاں خوشگوار موسم، شیریں پانی اور خوبصورت مناظر کی وجہ سے مشہور ہیں، معجم البلدان ج ۲ ص ۴۲۱، طبع بیروت ۱۹۵۷ء

[3] بصرہ اور خلیج کے درمیان کے ایک سلسلۂ کوہ (جغرافیہ جزیرہ عربیہ طبع قاہرہ ۱۹۲۵ء)

ذکر کریں تاکہ "آتش شوق" تیز ہو، اور جس وقت اصل مضمون پر آئیں اس وقت بیان کرنے کا جوش اور سننے والوں کا اشتیاق نقطۂ کمال پر پہنچ چکا ہو، تشبیب کا یہ مضمون عام طور سے قصیدہ کے ایک تہائی یا نصف پر حاوی ہوتا ہے، امام بوصیریؒ نے ان دو شعروں سے وہ مقصد حاصل کر لیا جس کے لیے تشبیب کے مضمون کو طول دیا جاتا تھا، عاشق کی والہانہ کیفیت کا اظہار مطلع کے پہلے ہی لفظ سے ہونے لگتا ہے، جب کہ وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ یہ آنسو جن میں خونِ جگر کی آمیزش ہے، کیوں بہنے لگے، آخر تیرے زخم کو کس نے چھیڑا، کیا دیکھ لیا؟ کیا سُن لیا؟ کیا دیارِ محبوب کے سمت کسی پہاڑی پر بجلی چمکی یا اس رخ کی کوئی ہوا چلی یا اس کے قرب وجوار کے باشندے یاد آگئے؟

سوز دروں کے اظہار کا یہ شاعرانہ اسلوب بہت ہی دل نشیں اور لطیف ہے کہ محبوب یا دیارِ محبوب کا نام بھی زبان پر نہ آئے، صرف انداز بیان سے عشق و وارفتگی کی روح جھلکنے لگے۔ شاعر یہاں عشق کی ایک خاص کیفیت بیان کر رہا ہے، جب کہ عاشق کو ہر شئے میں محبوب کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے، ہر بات میں اس کی بات یاد آنے لگتی ہے، اس کے زخم کو کریدنے کے لیے ایک اشارہ چاہیے اس کے رونے کے لیے ایک بہانہ درکار ہے۔

اردو میں کلیم کا یہ شعر بھی اسی کیفیت کا ترجمان ہے:

لگتی ہے اب تو قلقل مینا سے دل پہ ٹھیس
وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

ایک دوسرے شاعر نے اس مضمون کو باندھا ہے:

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

امام بوصیریؒ اسی مضمون کو اپنے پیرایہ میں بیان کرنے کے بعد ذرا اور گہرے ہو جاتے ہیں:

فَمَا لِعَيْنَيْكَ اِنْ قُلْتَ اكْفُفَا هَمَتَا   وَمَا لِقَلْبِكَ اِنْ قُلْتَ اسْتَفِقْ يَهِمِ

(آخر تیری آنکھوں کو کیا روگ لگ گیا ہے، ان سے کہو رک جائیں، آنسو نہ بہائیں تو اُلٹے ان کی جھڑی لگ جاتی ہے اور یہ تیرے دل کو کیا ہو گیا ہے، اس سے کہو کہ سنبھل جا تو یہ اور بھٹکنے لگتا ہے۔)

دل کا سنبھلنا یا اس کا قرار میں آجانا عشق کی موت ہے، اس سے ہر عاشق پناہ مانگتا ہے، ایک حماسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

فَيَا حُبَّهَا زِدْنِي جَوًى كُلَّ لَيْلَةٍ   وَيَا سَلْوَةَ الْاَيَّامِ! مَوْعِدُكِ الْحَشْرُ

(اے عشق محبوب! تیری سوزش ہر رات تیز ہوتی رہے، اور اے زندگی کے سکون بخش لمحات! تجھ سے ملنا اب قیامت ہی کے دن ہو۔)

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی ایک مناجات میں فرماتے ہیں:

دردِ دل سینے میں رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے
جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دیدے

امام بوصیریؒ نے اپنے اس شعر میں اسی کیفیت کو دوسرے پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ عشقِ محبوب میں نہ ان کی آنکھوں کو آنسو روکنے کا یارا ہے نہ دل کو قرار ہے۔

اَيَحْسَبُ الصَّبُّ اَنَّ الْحُبَّ مُنْكَتِمٌ   مَا بَيْنَ مُنْسَجِمٍ مِنْهُ، وَمُضْطَرِمِ

(کیا عاشق کا یہ خیال ہے کہ اس کی برستی آنکھ اور دھڑکتے دل سے آشکارا ہونے والی محبت پوشیدہ رہ سکتی ہے؟)

لَوْلَا الْهَوٰى لَمْ تُرِقْ دَمْعًا عَلٰى طَلَلٍ   وَلَا اَرِقْتَ لِذِكْرِ الْبَانِ وَالْعَلَمِ

(اگر محبت نہ ہوتی تو تم کسی ٹیلے کو دیکھ کر آنسو نہ بہاتے، اور یہ سرو کے درخت اور کسی منزل کے نشان کا ذکر تمہاری نیند نہ اچاٹ کرتے۔)

یہ بھی عربی شاعری کا روایتی انداز ہے کہ شاعر ان مقامات سے جب گزرتا ہے یا وہ مقامات جب اس کے ذہن میں آتے ہیں، جن کو محبوب سے کسی طرح کی نسبت رہی ہو، یا وہ وہاں سے گزرا ہو تو اس کا زخم ہرا ہونے لگتا ہے، یہ کیفیت اس وقت بھی ہوتی ہے جب محبوب کو یاد دلانے والی کوئی چیز سامنے آجائے، مثلاً چاندنی دیکھی تو اس کو اپنے محبوب کی صباحت یاد آگئی، خوشبو سونگھی تو اس کے دل کی دنیا مہک اٹھی کہ یہ خوشبو تو اس کے محبوب کی خوشبو سے مشابہ ہے، اس شعر میں "بان" اور "علم" کے دو لفظ آئے ہیں، "بان" سرو کے مانند طویل درخت ہے، اور "علم" اونچی پہاڑی کو بھی کہتے ہیں، اور نشان منزل کو بھی۔

لیکن ان دونوں شعروں میں ایک نفسیاتی کشمکش کا اظہار مقصود ہے، یہ کشمکش ان مخلصین کو پیش آتی ہے جو اپنے عشق میں سچے ہوتے ہیں، مگر عشق کا دعویٰ تو کجا ان کو ہمیشہ اپنے مخلص ہونے میں شک رہتا ہے، ایسا عاشق اپنے دل کو بار بار ٹٹولتا ہے کہ کیا واقعی وہ اس ذات سے محبت رکھتا ہے، جس کا وہ مدعی ہے؟ کہیں یہ فریبِ نفس تو نہیں ہے؟ مگر اس کا یقین اس کو کون دلائے ..... اس لیے خود ہی اپنے دل کو تسلی بھی دیتا ہے، اور سمجھاتا ہے کہ وہ یقیناً محبت کی دولت رکھتا ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ آنسو نہ بہتے اور دیارِ محبوب کے ان نشانات کو دیکھ کر اس کا دل بیتاب نہ ہو جاتا، یہ نیند کا اچاٹ ہونا، یہ چہرے کی زردی، محبوب سے دور کی بھی نسبت رکھنے والی چیز کی طرف وارفتگی میں بڑھنا اور ان پر سو سو جان سے قربان ہونا بے سبب تو نہیں ہے!

لہٰذا وہ اپنے آپ کو یقین دلاتا ہے کہ اس کا عشق واقعی عشق اور اس کے اندر محبت کی بیتابی ہے، کیونکہ محبت کی علامتیں اس کے اندر موجود ہیں، اس کے بعد جو شعر ہے اس میں بھی شاعر اسی مضمون پر زور دے رہا ہے۔

فَكَيْفَ تُنْكِرُ حُبًّا بَعْدَ مَا شَهِدَتْ عَلَيْكَ عَدْلًا دُمُوعٌ وَالسَّقَمُ

(تو کس طرح اس محبت کا انکار کرے گا جب کہ تیرے شک و شبہ کے خلاف دو گواہ عادل موجود ہیں، آنسو اور اندر پگھلنے کا روگ!)

وَاثْبَتَ الْوَجْدُ خَطَّيْ عَبْرَةٍ وَضَنًى مِثْلَ الْبَهَارِ عَلَى خَدَّيْكَ وَالْعَنَمِ

(محبت نے تمہارے رُخسار پر دو لکیریں ثبت کر دی ہیں، ایک تو آنسو کی لکیر سے جو عَنَم کے پھول کی طرح سُرخی مائل ہے، دوسری لکیر اندرونی روگ سے جو بہار کے پھول کی طرح زرد ہے۔)

اس شعر میں "بہار" کا لفظ آیا ہے، وہ فارسی کا موسم بہار نہیں ہے بلکہ ایک پھول کا نام ہے جو ہار سنگھار سے ملتا جلتا ہوتا ہے، اور اس کی رنگت زرد ہوتی ہے، بے خوابی، نقاہت اور رنج و غم کے ہجوم میں چہرہ کا زرد پڑ جانا عام بات ہے۔

حضرت بوصیریؒ اس شعر میں بھی اسی مفہوم پر زور دے رہے ہیں کہ ان کے اپنے اخلاص و صدقِ محبت میں شک نہیں کرنا چاہیے، حبِ نبوی کی دولت کو فریبِ نفس نہیں سمجھنا چاہیے، اور

اپنے آپ کو یقین دلانے کے لیے اپنی آہ و زاری، اشک ریزی اور جسم کے گھلنے کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں:—

نَعَمْ سَرَى طَيْفُ مَنْ أَهْوَى فَأَرَّقَنِي وَالْحُبُّ يَعْتَرِضُ اللَّذَّاتِ بِالْأَلَمِ

(سچ ہے! محبوب ہمیں خواب میں نظر آیا اور اس خواب نے میری نیند اچاٹ کر دی، کیوں نہ ہو محبت لذتوں میں رخنہ ڈالا ہی کرتی ہے۔)

نیند کا اچاٹ ہو جانا، ایک حاصل شدہ لذت کا ضائع ہو جانا ہے، اسی کو رنج یا "الم" کا "رخنہ" قرار دے رہا ہے، لیکن شکوہ کے طور پر نہیں بلکہ شکر کے انداز میں، اس اعتراف کے ساتھ کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، وہ محبت ہی کیا جو کسی لذت کو نہ چھینے۔

يَا لَائِمِي فِي الْهَوَى الْعُذْرِيِّ مَعْذِرَةً مِنِّي إِلَيْكَ، وَلَوْ أَنْصَفْتَ لَمْ تَلُمِ

(اے میرے ملامت کرنے والے ایک پاک محبت پر، میری تجھ سے معذرت ہے، حالانکہ اگر تو انصاف کرتا تو کبھی ملامت نہ کرتا۔)

"پاک محبت" جس لفظ کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ "الحب العذری" ہے، اس ترکیب کا ایک خاص پس منظر ہے، "بنو عذرہ" نامی یمن میں ایک قبیلہ تھا، جس میں عربی کے متعدد شعراء پیدا ہوئے[1] جن کا مشترک وصف یہ تھا کہ ان کے اشعار میں سوز و گداز بہت ہوتا تھا، وہ محبوب کی جسمانی قرب اور وصال کے متمنی نہیں ہوتے تھے، یہاں تک کہ یہ مشہور ہو گیا کہ "بنو عذرہ" کے قبیلہ میں جو عاشق ہوا وہ اپنے محبوب پر پروانہ وار فدا ہو گیا، اور کبھی ہوسناکی کے قریب نہیں گیا، انہی شعراء کی نسبت سے ایسی محبت کو "حب عذری" کہا جانے لگا، مترجم کا خیال ہے کہ اردو میں "پاک محبت" سے وہ مفہوم ادا ہو جاتا ہے، جو شاعر کا مقصود ہے،

افسانہ نویس اس طرح کی محبت کو "افلاطونی محبت" لکھتے ہیں۔

ایک مزید بات قابل تشریح یہ ہے کہ جس طرح اردو کی روایتی شاعری میں "رقیب"، "واعظ" اور "ناصح" کے نام سے متعدد سامنے آتے ہیں، اسی طرح عربی میں "محبت کے جرم" پر ملامت کرنے

---

[1] مثال کے طور پر جمیل بن معمر وغیرہ

والے، اور محبوب سے عاشق کی چغلی کرنے والے، عشقیہ شاعری کے دو کردار ہیں، عربی میں رقیب کا کردار نہیں ہوتا، ہاں "واعظ" اور "ناصح" کا کردار موجود ہے، "لائم" ملامت کرنے والے سے یاد کیا جاتا ہے، چونکہ اس قصیدہ کی "تشبیب" کے یہ اشعار ہیں، اس لیے ان روایتی کرداروں کو بھی شاعر نے باندھا ہے، لیکن چند اشعار کے بعد آپ ملاحظہ کریں گے کہ ان کی کرداروں سے شاعر نے کتنا پاکیزہ کام لیا ہے، اور بات کا رُخ کس طرح مادیت سے روحانیت کی طرف پھیر دیا ہے۔

عَدَتْكَ حَالِي لَا سِرِّي بِمُسْتَتِرٍ عَنِ الْوُشَاةِ وَلَا دَائِي بِمُنْحَسِمِ

گزشتہ شعر سے ہر شعر کے معنی مربوط ہیں، یعنی اے ملامت کرنے والے:

(تم پر میرا حال عیاں ہے، اور چغل خوروں سے میرا کوئی راز بھی چھپا ہوا نہیں ہے،

اور نہ میری بیماری ایسی ہے کہ ختم ہو جائے۔)

اس شعر کے مصرعہ اول کے پہلے جملہ "عدتك حالي" کو نحوی ترکیبوں کے الٹ پھیر سے عرب شارحین نے متعدد احتمالی معانی پہنائے ہیں، کسی نے کہا یہ دعائیہ جملہ ہے کہ خدا تم کو اس روگ میں گرفتار نہ کرے۔ کسی نے کہا یہ بددعا ہے کہ کاش تم کو بھی یہی روگ لگے تو جانو کہ مجھ پہ کیا گزرتی ہے، لیکن اکثر شارحین نے اس کو جملہ خبریہ بتایا ہے جیسا کہ یہاں ترجمہ کیا گیا۔

مَحَضْتَنِي النُّصْحَ لَكِنْ لَسْتُ أَسْمَعُهُ إِنَّ الْمُحِبَّ عَنِ الْعُذَّالِ فِي صَمَمِ

(اے ملامت کرنے والے، بلاشبہ تو نے بہت اخلاص کے ساتھ محض ہمدردی

میں میری خیر خواہی کی کہ مجھے ترک محبت کی نصیحت کی، لیکن تجھے معلوم ہے کہ عاشق

ناصحوں کی طرف سے بہرا ہو جاتا ہے۔)

إِنِّي اتَّهَمْتُ نَصِيحَ الشَّيْبِ فِي عَذَلِي وَالشَّيْبُ أَبْعَدُ فِي نُصْحٍ عَنِ التُّهَمِ

(میں نے پیری (بڑھاپے) کی نصیحت کو بھی ملامت کے باب میں ملزم قرار دیا،

حالانکہ پیری کی نصیحت کو کسی طرح دور کا بھی الزام نہیں دیا جا سکتا۔)

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ عشق و محبت کا تعلق جوانی سے ہے، جب بڑھاپا آگیا تو انسان کا ضمیر خود اس کو ملامت کرنے لگتا ہے، بڑھاپا اس کے احساس کو جھنجھوڑتا ہے کہ اب تو تو شرم کر، مرنے کا وقت قریب آیا، گویا بڑھاپا بذات خود ایک طرح کا ناصح ہے اور اس کی ملامت کو دور کا بھی حسد سے واسطہ نہیں

ہوتا، دوسرے ملامت کرنے والوں کو تو کہا جا سکتا ہے کہ انھیں عاشق سے حسد ہوگا، یا اس کا اپنا کوئی مطلب ہوگا مگر بڑھاپے کو نصیحت و ملامت کے باب میں ملزم نہیں قرار دیا جا سکتا، شاعر کہتا ہے کہ میں نے ایسے معصوم اور ہر شبہ سے بالاتر ناصح یعنی پیری کی نصیحت نہیں سُنی تو تم لوگ اے نصیحت کرنے والو! کس شمار و قطار میں ہو؟

اب دیکھیے کہ یہاں سے شاعر حضرت بوصیری اس تشبیب کے مضمون کو بھی کس خوبصورتی سے مادیت سے روحانیت کی طرف منتقل کر رہے ہیں کہ پڑھنے والے کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اصطلاح میں "گریز" اس کو کہتے ہیں کہ جہاں تشبیب یا غیر متعلق یا تمہیدی مضمون ختم کرنے کے بعد شاعر اپنے اصل مدعا کو بیان کرنے لگتا ہے۔

لیکن حضرت بوصیریؒ کے قصیدے میں تشبیب ہی کے اندر ایک پاکیزہ گریز موجود ہے، وہ گریز جہاں سے وہ نعت شروع کریں گے، وہ تو بعد میں آئے گا، سردست یہ "گریز" ایک مستقل وعظ ہے، جو مدح نبویؐ کے لیے قاری کے احساس اور اس کے افکار کو تیار کر رہا ہے، نعت نبویؐ ہے بھی چیز ایسی کہ اس کے لیے فکر کو پہلے سے طاہر کر لیا جائے، نفس کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا جائے، آنکھوں کو آب جگر سے غسل صحت دیا جائے۔[1]

براہ راست نعت کے اشعار سے پہلے ذیل کے تمام اشعار اسی قبیل کے ہیں، جس میں حضرت بوصیریؒ نے مخاطب تو اپنے نفس کو کیا ہے، مگر وہ حکمت و مواعظ کی باتیں فرما گئے ہیں، جو ہر ایک کے لیے بہت ہی موثر وعظ ہے۔

فَإِنَّ أَمَّارَتِي بِالسُّوءِ مَا اتَّعَظَتْ مِنْ جَهْلِهَا بِنَذِيرِ الشَّيْبِ وَالْهَرَمِ

(کیونکہ میرا نفس امارہ (برائیوں پر اکسانے والا دل) بڑھاپے اور پیری کی دھمکیوں

کے باوجود اپنی نادانیوں سے باز نہیں آیا۔

---

[1] یہ جملہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا ہے "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" کے مضمون میں مدینہ منورہ کی حاضری کا ذکر کرتے وقت مولانا نے آنسو یا اشک کے بجائے اس حسین کنایہ میں اس کو بیان کیا ہے۔

وَلَا أَعْدَدْتُ مِنَ الْفِعْلِ الْجَمِيْلِ قِرَى ۔۔۔ ضَيْفٍ أَلَمَّ بِرَأْسِي غَيْرَ مُحْتَشِمٍ

(اور میرے اس نفس نے اعمال صالحہ سے اس مہمان کی تواضع کا پہلے سے انتظام نہیں رکھا جو سر کے بالوں پر ناخواندہ آگیا ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ بالوں کی سفیدی جو پیری کی علامت ہے اور پیری جو فنا کی پیامی ہے، دل کو خواہ جس قدر بھی بری لگے، مگر وہ اب ایک مہمان کی حیثیت سے آچکی ہے، سر پر چمک رہی ہے۔ اس مہمان کی مہمان داری اور تواضع اعمال صالحہ سے کرنا چاہیے تھی، جس سے اپنا دامن خالی ہے۔ اور گھر میں وہ اعمال صالحہ کا بوریہ نہیں ہے جس پر اس مہمان کو بٹھاتے۔

لَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ أَنِّي مَا أُوَقِّرُهُ ۔۔۔ كَتَمْتُ سِرًّا بَدَا لِي مِنْهُ بِالْكَتَمِ

(اگر میں جانتا کہ اس مہمان (بڑھاپے) کی تواضع اعمال صالحہ سے نہیں کر سکوں گا تو پیری کی آمد کو جو پہلے ایک راز تھی، یعنی چند ہی بال سفید ہوئے تھے، مہندی یا خضاب سے چھپا دیتا۔)

درحقیقت یہ شعر ایک طنز ہے کہ بڑھاپے کو چھپایا نہیں جا سکتا اور اگر مصنوعی طریقہ پر چھپا بھی دیا گیا تو زندگی کو موت سے قریب کرنے سے یہ حرکتیں روک نہیں سکتیں، چنانچہ اس کے بعد کے اشعار میں مزید وضاحت کرتے ہیں اور بڑی حکمت کی باتیں فرماتے ہیں۔

مَنْ لِي بِرَدِّ جِمَاحٍ مِنْ غَوَايَتِهَا ۔۔۔ كَمَا يُرَدُّ جِمَاحُ الْخَيْلِ بِاللُّجُمِ

(کاش! کوئی نفس سرکش کو قابو میں لے آتا کہ وہ بھٹکنے نہ پائے، جیسے لگام سے گھوڑوں کی سرکشی اور جھک کو قابو میں کر لیا جاتا ہے۔)

فَلَا تَرُمْ بِالْمَعَاصِي كَسْرَ شَهْوَتِهَا ۔۔۔ إِنَّ الطَّعَامَ يُقَوِّي شَهْوَةَ النَّهِمِ

(معصیت کا علاج معصیت سے کرنے کی کوشش نہ کرو کھانا لالچی کی بھوک بڑھاتا ہے۔)

تو اس شعر کا مفہوم ہے مگر ان ترکیب کے لحاظ سے اس شعر کا ترجمہ یوں ہوگا:

(نفس کی خواہشات کو دبانے کا قصد معصیت کے ذریعہ نہ کرو، کیونکہ کھانا لالچی کی بھوک بڑھاتا ہے۔)

اس شعر میں دراصل بعض یونانی فلاسفہ کا جواب ہے، جن کا خیال تھا کہ نفس کی بھوک پوری کردو تو وہ خود سیر ہو کر اس چیز سے متنفر ہو جائے گا، جس سے اس کو روکا جا رہا ہے۔ علامہ بوصیریؒ اس کی تردید کرتے ہوئے دلیل کے طور پر فرماتے ہیں:

النَّفْسُ كَالطِّفْلِ إِنْ تُهْمِلْهُ شَبَّ عَلَى ۔۔۔ حُبِّ الرَّضَاعِ وَإِنْ تَفْطِمْهُ يَنْفَطِمِ

(انسان کا نفس تو ایک شیر خوار بچہ کی طرح ہے اگر اس کو دودھ پلانا نہ چھوڑو تو بڑھاپے تک رضاعت کا طالب رہے گا، اور اگر اس کا دودھ چھڑا دو تو چھوٹ جائے گا۔)

فَاصْرِفْ هَوَاهَا وَحَاذِرْ أَنْ تُوَلِّيَهُ ۔۔۔ إِنَّ الْهَوَى مَا تَوَلَّى يُصْمِ أَوْ يَصِمِ

(نفس کی خواہشات کو دباؤ، اور اس بات سے ڈرتے رہو کہ کہیں اس کے ہاتھ تمہاری باگ ڈور نہ آجائے، کیونکہ خواہشات کی جب بھی حکومت ہوگی وہ یا تو ہلاک کر دے گی یا پھر رسوا کر کے چھوڑے گی۔)

ان اشعار میں (ہویٰ) کا لفظ خواہش نفسانی کے معنوں میں آیا ہے، برخلاف ابتدائی اشعار کے جن میں یہی لفظ محبت یا عشق کے معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔

وَرَاعِهَا وَهِيَ فِي الْأَعْمَالِ سَائِمَةٌ ۔۔۔ وَإِنْ هِيَ اسْتَحْلَتِ الْمَرْعَى فَلَا تُسِمِ

(اور ذرا نفس کی دیکھ بھال اس حال میں بھی کرتے رہو جب وہ اعمال صالحہ کے انجام دینے میں منہمک ہو، اور اگر یہ دیکھو کہ اس میدان میں "چرنا" اس کو بھلا لگنے لگا ہے تو پھر اس کو اس میدان میں نہ چراؤ۔)

مطلب یہ ہے کہ نفس کے فریب پر بھی نگاہ رکھو ایسا بھی ہوتا ہے کہ جد و جہد سے فرار کی خاطر ریا و نمود کے لیے بھی وہ بعض اچھے کام میں مشغول ہو جاتا ہے، اور اسی میں اس کو مزہ آنے لگتا ہے اور غرور نفس پیدا ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر اپنے نفس کی یہ حالت دیکھو تو پھر اس کو اعمال صالحہ میں سے کسی ایسے کام پر مامور کرو جس میں اس کا جی نہ لگتا ہو، اور مزہ نہ ملتا ہو۔ واضح رہے کہ حضرت بوصیریؒ کا مقصد "اعمال" سے فرائض و واجبات نہیں ہے، کیونکہ وہ تو جی لگے یا نہ لگے، مزہ ملے یا نہ ملے ہر حال میں انجام دینا ہے۔ اگر کسی کا فرض نمازوں میں جی لگنے لگے اور حضوری کی لذت حاصل ہونے لگے تو محض نفس کی خلاف ورزی کی خاطر اس کو چھڑایا نہیں جا سکتا، البتہ بعض نفلی عبادتیں اور تقرب کے دوسرے

کام جس کے بجائے دوسرے کام ہو سکتے ہیں، اس میں سے کوئی کام اگر ایسا ہو جس میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو ثانوی درجہ حاصل ہو، اصل جذبہ لذت اندوزی کا ہو تو ایسے کام سے خواہ وہ کتنا ہی اہم اور قابل قدر کیوں نہ ہو، احتراز کرنا ہی بہتر ہے، کیونکہ :

كَمْ حَسَّنَتْ لَذَّةً لِلْمَرْءِ قَاتِلَةً مِنْ حَيْثُ لَمْ يَدْرِ أَنَّ السَّمَّ فِي الدَّسَمِ

(بسا اوقات کسی مہلک لذت کو نفس حسین بنا کر دکھا دیتا ہے، اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس میں ہلاکت کا سامان کہاں پوشیدہ تھا، اور یہ کہ اکثر زہر لذیذ کھانوں ہی میں ملا ہوتا ہے۔)

وَاخْشَ الدَّسَائِسَ مِنْ جُوعٍ وَمِنْ شَبَعٍ فَرُبَّ مَخْمَصَةٍ شَرٌّ مِنَ التُّخَمِ

(بھوکے ہونے، شکم سیر ہونے، دونوں صورتوں میں نفس کی سازشوں سے ڈرتے رہو، کیونکہ کبھی فاقے کی کیفیت بدہضمی سے بھی زیادہ بری ثابت ہوتی ہے۔)

وَاسْتَفْرِغِ الدَّمْعَ مِنْ عَيْنٍ قَدِ امْتَلَأَتْ مِنَ الْمَحَارِمِ وَالْزَمْ حِمْيَةَ النَّدَمِ

(اور اس آنکھ سے آنسو اچھی طرح بہا ڈالو جو کہ محرمات سے بھر چکی ہے، اور شرمندگی وندامت کا پرہیز پابندی سے کرتے رہو۔)

یعنی آنکھ جو نامحرموں کو اور حرام اشیاء کو دیکھتے دیکھتے بھر گئی ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ توبہ وندامت کے آنسو اس درجہ بہاؤ جیسے کنویں کا سب پانی نکال کر اس کو خالی کر دیا جاتا ہے، "استفراغ" کے معنی ہیں پتیلی یا کسی برتن میں یا کنویں میں جو کچھ ہے، ان سب کو نکال کر صاف کر دینا اسی طرح آنکھ کو بھی علاج کی ضرورت ہے کہ آنسوؤں سے اس کو اچھی طرح دھو کر پاک کیا جائے، علاج کے ساتھ احتیاطی تدبیر بھی ضروری ہے تاکہ آئندہ مرض کا حملہ نہ ہو، لہٰذا ندامت کے احساس کو ہمیشہ تازہ رکھو، یہی احتیاط پر مائل کرے گا۔

یہ شعر علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کی دور رس باریک بین اور وسیع نظر کا مظہر ہے، اس مختصر سے اور سادہ ترکیب کے شعر میں انھوں نے جوگیانہ فلسفہ، اور غیر اسلامی طریق تزکیہ کا بہت خوب صورتی سے رد کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جسم کے مطالبات کو اس درجہ نظر انداز کیا جائے کہ اس کے اندر سے مادیت کا عنصر ہی ختم ہو جائے، کیونکہ جوگیانہ تصوف کے رو سے جسم انسانی روح کا قید خانہ ہے، لہٰذا

روح کو جلا دینے اور نکھارنے کے لیے ضروری ہے کہ جسم کو فاقہ دے دے کر محیر العقول مجاہدات کرا کے، غیر فطری شدائد کے ساتھ عبادتیں کرا کے اس کو گھلا یا جائے یہاں تک کہ جسم کا نہ کوئی تقاضہ باقی رہے، اور نہ خواہشات پیدا ہو سکیں۔

اسلامی تعلیمات سراسر اس نظریہ کے مخالف ہیں، انسانیت کے لیے اسوۂ کامل حضور اکرم نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، جس میں روح اور جسم دونوں کے مطالبات کمال اعتدال اور معجزانہ توازن کے ساتھ پورے کیے گئے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "حجۃ اللہ البالغۃ" میں لکھا ہے کہ انسانی جسم کے کچھ مطالبات ہیں، جیسے بھوک و پیاس اور جنس وغیرہ ان کو ہم مادی طلب کہتے ہیں، دوسرے روح کے مطالبات ہیں، مثلاً اپنے خالق کے آگے سر نیاز خم کرنے کا جذبہ، اللہ کی ذات وصفات کا علم حاصل کرنے کا جذبہ، اس کی خوشنودی کے لیے اپنے آپ کو مٹا دینے کا جذبہ، جس کو شاہ صاحب روحانی قوت سے تعبیر فرماتے ہیں، یہ دونوں جذبے ہر انسان میں پائے جاتے ہیں، لیکن کسی میں ایک قوت غالب ہوتی ہے، کسی میں دوسری، کسی کے اندر دونوں طاقتوں میں مصالحت ہوتی ہے، کسی میں منافست یعنی کوئی دونوں مطالبے خوش اسلوبی سے پورا کرتا ہے، اور کوئی ایسا ہوتا ہے کہ کبھی فرشتہ ہے تو کبھی شیطان، دونوں طاقتیں اس کو اپنی اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ انبیائے کرام کی روحانیت اور مادیت دونوں قوی تر ہوتی ہے، اور ان کے درمیان مصالحت رہتی ہے۔

مقصود اس تفصیل سے یہی بیان کرنا تھا کہ جسم کے تقاضے پوری شدت کے ساتھ ایک تندرست اور صحت مند انسان میں موجود ہونا چاہیے، وہ انبیائے کرام میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔

علامہ بوصیری فرماتے ہیں کہ انبیائے کرام کا طریقہ چھوڑ کر کوئی شخص فاقہ کر کر کے اپنے آپ کو اس امید میں ہلاک کرے کہ اس کی روحانیت جاگ اٹھے گی، دراصل یہی شیطان کی ایک چال اور نفس کا فریب ہے، فقر، افلاس بھی کبھی انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے، بھوکے رہنے کی بہ نسبت سیر شکم ہو کر کھا لینا زیادہ احتیاط کی بات ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ انسان ایک چوپایہ کی طرح صرف کھاتا ہی رہے، اور غیر اختیاری مشقت برداشت کرتا رہے، اسی لیے انھوں نے شروع ہی میں فرمایا کہ بھوک اور شکم سیر ہونے کی حالتوں

میں نفس کی سازشوں سے ڈرتے رہو، خطرہ دونوں میں ہے، اعتدال اور توازن ہر کام میں مطلوب و مقصود ہے

وَخَالِفِ النَّفْسَ وَالشَّيْطَانَ وَاعْصِهِمَا وَإِنْ هُمَا مَحَضَاكَ النُّصْحَ فَاتَّهِمِ
وَلَا تُطِعْ مِنْهُمَا خَصْمًا وَلَا حَكَمًا فَأَنْتَ تَعْرِفُ كَيْدَ الْخَصْمِ وَالْحَكَمِ

(نفس اور شیطان کی مخالفت کرتے رہو اور کھل کر اس کی حکم عدولی کرو، اور اگر یہ دونوں مخلصانہ خیر خواہی کا دعویٰ کریں تو ان کو مجرم ٹھہراؤ۔)

(نفس اور شیطان میں سے کسی کی بھی فریق بنا کر یا قاضی بنا کر اطاعت نہ کرو کیونکہ تمھیں معلوم ہے کہ ایسے فریق اور ایسے قاضی کی کیا سازش ہوگی۔)

مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات انسان کوئی بُرا کام کرتا ہے، اور اس کا دل یا شیطانی وسوسہ اس کو تاویل کے ذریعہ مفید کام یا ضروری کام کی حیثیت سے سامنے لے آتا ہے، مثلاً ایک شخص نے چوری کی، اس کے نفس یا شیطان نے اس کو سمجھایا کہ یہ دولتمند جو غریبوں کا خون چوس کر کے مالدار بن گئے ہیں، اور جو غریبوں کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان کی مرضی کے خلاف ان سے چھین کر یا چھپ کر کچھ مال لے لیا گیا تو یہ ایک بہادری کا کارنامہ ہوا، اس کو وہ چوری نہیں کہا جا سکتا، جس کی مذہب میں مذمت آئی ہے۔ اسی طرح دوسرے جرائم کی بھی تاویل کی جاتی ہے، یا کی جا سکتی ہے، جرائم اور حرام کے ارتکاب میں جب نفس دھوکہ دے سکتا ہے تو مختلف فیہ مسائل بدعات و رسوم کا پوچھنا ہی کیا ہے، لہٰذا جب بھی نفس یا شیطان خیر خواہی کے پردہ میں اس طرح کی تاویل سمجھائے تو چاہیے کہ انسان اس مجرمانہ عقلیت کو ملزم قرار دے۔

دوسرے شعر میں یہ فرماتے ہیں کہ نفس تمھارے دینی شعور اور احکام و اطاعت کی راہ میں اگر فریق بن کر آئے تو اس کی حکم عدولی کو فرض سمجھو اس طرح فیصلہ کا اختیار کبھی دشمن کو نہ دو اگر برائی پر اُکسانے والے نفس کو قاضی بنا دیا۔ یعنی دل کے فیصلے کو قبول کر لیا تو یہ ایسا ہی ہے، جیسے کسی چالباز اور سازشی دشمن کے ہاتھوں اپنا فیصلہ کرایا جائے۔

أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ مِنْ قَوْلٍ بِلَا عَمَلٍ لَقَدْ نَسَبْتُ بِهِ نَسْلًا لِذِي عَقَمِ
أَمَرْتُكَ الْخَيْرَ لٰكِنْ مَا ائْتَمَرْتُ بِهِ وَمَا اسْتَقَمْتُ فَمَا قَوْلِي لَكَ اسْتَقِمِ

(قول بلا عمل کے (جرم) کی اللہ سے معافی چاہتا ہوں، درحقیقت میں نے بغیر خود عمل

کیے ہوئے صرف باتیں بنا کر ایسا کام کیا ہے جیسے) میں نے ایک بانجھ کی نسل کا نسب تیار کر دیا۔)

(میں نے تم کو تو نیکی کی ہدایت کی مگر خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوا، اور نہ ان باتوں سے فائدہ اٹھایا تو پھر میری اس بات کا کیا وزن رہ جاتا ہے جو میں تم سے کہتا ہوں کہ "راہ راست پر قائم رہو۔")

وَلَا تَزَوَّدْتُ قَبْلَ الْمَوْتِ نَافِلَةً وَلَمْ أُصَلِّ سِوَى فَرْضٍ وَلَمْ أَصُمِ

(میں نے اتنا بھی تو نہیں کیا کہ مرنے سے پہلے کچھ نوافل کا توشہ جمع کر لیتا، سوائے فرض نماز، روزے کے میں نے نہ تو نمازیں پڑھیں اور نہ روزے رکھے۔)

اس انکسار ندامت کے مضمون ہی سے علامہ بوصیری اپنے قصیدے کے اصل مضمون یعنی نعت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گریز کرتے ہیں۔

ظَلَمْتُ سُنَّةَ مَنْ أَحْيَا الظَّلَامَ إِلَى أَنِ اشْتَكَتْ قَدَمَاهُ الضُّرَّ مِنْ وَرَمِ

(میں نے اس ذات گرامی کی راہ ہدایت پر ظلم کیا، جو راتوں کو بیدار رہا کرتے تھے، اس حد تک کہ آپ کے پائے مبارک پر ورم آجایا کرتا تھا۔)

اس شعر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تہجد کی طرف اشارہ ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: كان يقوم حتى تتفطر قدماه یعنی آپؐ اتنی دیر قیام فرماتے تھے کہ آپؐ کے دونوں پائے مبارک پھٹ پھٹ جاتے تھے۔

حضرت مغیرہ سے روایت ہے:

ان كان النبي صلى الله عليه وسلم ليقوم أو ليصلي حتى ترم قدماه او ساقاه فيقال له فيقول افلا أكون عبدًا شكورًا

یعنی (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر قیام فرماتے تھے (یا) نماز پڑھتے تھے (روایتا

لہ یہ دونوں روایتیں صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب "قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللیل" میں مذکور ہیں۔

میں لفظی اختلاف ہے) کہ آپؐ کے دونوں پائے مبارک ورم کر جایا کرتے تھے، صحابہؓ عرض کرتے کہ آپؐ اتنی مشقت کیوں برداشت فرماتے ہیں؟ تو آپ فرماتے کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔)

اس شعر سے ایک گمان یہ ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ کا یہی معمول تھا، لیکن احادیث و شمائل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ عام طور سے مع وتر گیارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے، زیادہ سے زیادہ پندرہ رکعت کی روایت ملتی ہے، لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ دو رکعت میں رات تمام ہو گئی، ایسا بھی ہوا کہ پہلی رکعت دو منزل یا تین منزل کی تلاوت فرمائی، رکوع، قیام کے بقدر کبھی کبھی طویل ہوتا تھا۔

علامہ بوصیریؒ فرماتے ہیں کہ جس ذات گرامی کی عبادتوں کا یہ حال ہو، اس کی سنّت پر ہم نے ظلم کیا، یعنی اس کا اتباع نہیں کیا تو ہم کس طرح اپنے آپ کو جاں نثار اور عاشق شمار کریں۔

وَشَدَّ مِنْ سَغَبٍ اَحْشَاءَهٗ وَطَوٰى تَحْتَ الْحِجَارَةِ كَشْحًا مُتْرَفَ الْاَدَمِ

(اور میں نے اس ذات گرامیؐ کی سنت پر ظلم کیا ہے جنھوں نے) بھوک کی شدّت کو دبانے کے لیے اپنے پیٹ کو باندھا اور اپنی کمر کے اوپری حصہ پر جس کی جلد انتہائی نازک تھی، پتھر رکھا۔)

صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ:

جئت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوما فوجدته جالسا مع اصحابه یحدثهم وقد عصب بطنه بعصابة فقالوا من الجوع۔

(ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپؐ اپنے صحابہؓ سے بیٹھے گفتگو فرما رہے ہیں، اور شکم مبارک کو ایک پٹکے (کپڑے کا ٹکڑا) سے باندھ رکھا ہے، لوگوں نے بتایا کہ یہ بھوک کی وجہ سے تھا۔)

وَرَاوَدَتْهُ الْجِبَالُ الشُّمُّ مِنْ ذَهَبٍ عَنْ نَفْسِهٖ فَاَرَاهَا اَيَّمَا شَمَمٍ

(اور سونے کے سربلند پہاڑوں نے حضور کا دل بہلانا چاہا مگر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی بے مثال بلندی کا مظاہرہ فرمایا۔)

یہ شعر بھی گزشتہ اشعار سے معنی میں مربوط ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم نے اس ذات گرامی کی سنت پر ظلم کیا، جن کی عبادت بے مثال تھی، جو اپنے اختیار کردہ فقر و افلاس میں زندگی گزارتے تھے، پیٹ پر پتھر باندھ کر رہتے تھے، اور اگر وہ چاہتے تو دنیا کی ساری دولت ان کے قدموں میں ڈھیر ہو سکتی تھی:

روی انه صلی اللہ علیه وسلم قال عرض علی ربی بطحاء مکة ذهبا فقلت لا یا رب ولکن اجوع یوما واشبع یوما فاذا اشبعت حمدتك واذا جعت تضرعت الیك ودعوتك۔

(روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے رب نے مکہ مکرمہ کے سارے کنکروں کو سونے میں تبدیل کر کے مجھے پیش کیا تو میں نے عرض کیا بار الٰہا! مجھے یہ نہ دے مجھے تو اتنا دیجیے کہ ایک دن بھوکا رہوں اور ایک روز شکم سیر ہو کر کھاؤں، جب شکم سیر ہو کر کھاؤں تو آپ کی حمد کروں اور جب بھوکا رہوں تو تجھ سے گڑگڑا کر مانگوں اور دعا کروں۔)

وَكَيْفَ تَدْعُوْ اِلَى الدُّنْيَا ضَرُوْرَةُ مَنْ لَوْلَاهُ لَمْ تَخْرُجِ الدُّنْيَا مِنَ الْعَدَمِ

(اور کس طرح دنیا کی طرف بلاتی اس ذات کو ضرورت جو ذات اگر نہ ہوتی تو دنیا عدم سے وجود کی طرف نہ لائی جاتی۔)

یعنی آپ اس دنیا کی خلقت کا باعث ہیں، آپؐ نہ ہوتے تو یہ کائنات نہ ہوتی، اپنے وجود کے لیے دنیا آپؐ کی طالب تھی، آپ سبب اور علت ہیں اس کائنات کی تخلیق کا، لہٰذا دنیا آپؐ کی طالب ہوئی تو سمجھ میں آنے والی بات ہے، لیکن آپ دنیا کے طالب ہوں، یا آپؐ کی ضرورت دنیا کی طرف آپ کو مائل کرے یہ کیونکر ممکن ہے۔

مُحَمَّدٌ سَيِّدُ الْكَوْنَيْنِ وَالثَّقَلَيْنِ وَالْفَرِيْقَيْنِ مِنْ عُرْبٍ وَمِنْ عَجَمٍ

(یہ جن کا تذکرہ ہو رہا ہے) وہ ذات گرامی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہے، جو دونوں جہاں کے سرور، جن و انس کے آقا اور عرب و عجم کے سردار ہیں۔)

نَبِيُّنَا الْاٰمِرُ النَّاهِيْ فَلَا اَحَدٌ اَبَرُّ فِيْ قَوْلِ "لَا" مِنْهُ وَلَا "نَعَمٍ"

(وہ ہمارے نبی ہیں، حکم دینے والے، روکنے والے، آپ سے زیادہ سچا، حق بات کہنے والا کوئی انسان نہیں ہے، آپ کے "ہاں" کہنے اور "نہیں" کہنے دونوں میں آپ کا کوئی

ہمسر نہیں ہے۔)

هُوَ الْحَبِيبُ الَّذِي تُرْجَى شَفَاعَتُهُ لِكُلِّ هَوْلٍ مِنَ الْأَهْوَالِ مُقْتَحِمِ

(آپ وہ محبوب (شخصیت کے مالک) ہیں، جس کی شفاعت کا آسرا ہر پیش آنے والی ہولناک حالت میں کیا جاتا ہے۔)

دَعَا إِلَى اللّٰهِ فَالْمُسْتَمْسِكُونَ بِهِ مُسْتَمْسِكُونَ بِحَبْلٍ غَيْرِ مُنْفَصِمِ

(آپ نے اللہ کے دین برحق کی طرف لوگوں کو دعوت دی، جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول کرکے دین کی رسی مضبوطی سے پکڑلی اور اس سے وابستہ رہے۔ وہ درحقیقت حق تعالیٰ کی اس مضبوط رسی کو پکڑنے والے ہیں جو کبھی ڈھیلی نہیں ہوسکتی اور نہ ٹوٹ سکتی ہے۔)

اس شعر میں اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے: فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ (توجو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے اور خدا پر ایمان لائے اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑلی ہے جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں۔)

فَاقَ النَّبِيِّينَ فِي خَلْقٍ وَفِي خُلُقٍ وَلَمْ يُدَانُوهُ فِي عِلْمٍ وَلَا كَرَمِ

(ہمارے رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم) تمام انبیائے کرام پر ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے بھی فوقیت رکھتے تھے اور اپنے اخلاق حمیدہ وصفات عالیہ کے لحاظ سے بھی، یہ تمام انبیائے کرام (باوجود اپنی جلالت شان اور شخصی واخلاقی عظمتوں کے) آپ کے مساوی ہونا تو کیا معنی قریب بھی نہیں ہوسکے نہ علم میں اور نہ سخاوت و بخشش میں۔

خَلق (خ کو زبر) مراد ظاہری شکل وصورت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے حسن ظاہر کی وہ رعنائی عطا کی تھی جس کا اندازہ ــــ ایک معمولی سا اندازہ ــــ اس روایت سے ہوتا ہے کہ ایک صحابی حضرت سمرہ بن جندب فرماتے ہیں کہ ایک رات جب پونم (چودھویں کا چاند) پورے جمال وکمال سے تاباں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یمنی چادر (جس میں سرخ دھاریاں ہوتی تھیں) پہنے ہوئے تھے، میں بار بار چاند کو دیکھتا پھر آپ کو دیکھتا، خدائے پاک جس کے قبضۂ قدرت میں میری

جان ہے اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے آپؐ کا جمال اس چاند سے کہیں زیادہ تابناک نظر آرہا تھا۔

مولانا تمنا عمادی پھلواروی نے اس پر یہ شعر کہا ہے ؎

ان کی صورت سے بہت ملتی ہے صورت تیری
رات بھر کیوں نہ تجھے چاند میں دیکھا ہی کروں

شمائل ترمذی میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لم ار مثلہ قبلہ ولا بعدہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔

(آپ کے جیسا نہ میں نے پہلے کسی کو دیکھا اور نہ آپؐ کے بعد کوئی ایسا نظر آیا ؎

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تم سا کہیں جسے

دوسرا لفظ خُلُق (خ اور ل دونوں کو پیش) عادات وخصائل، رحم ورافت، محبت وشجاعت، بخشش وکرم، شفقت اور بندہ پروری کی صفات کے لیے یہ جامع لفظ ہے، اس کے بیان کے لیے تو دفتر کے دفتر ناکافی ہیں ؎

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

دوسرے مصرعہ سے شیخ بوصیریؒ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو 'المصطفین الاخیار' فرمایا ہے یعنی چنے ہوئے 'انتخاب کیے ہوئے' افراد جن کی نظیر اخلاق وشمائل میں نہیں مل سکتی، ان نبیوں اور رسولوں (علیہم السلام) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس درجہ ممتاز اور اس درجہ فائق تھے کہ وہ لوگ باوجود اپنی عظمتوں کے ہم پلہ کیا ہوتے اس بلندی کو چھو بھی نہ سکے، اس کے قریب بھی نہ جاسکے۔ اس شعر میں دو باتیں قابل لحاظ اور لائق تشریح ہیں، ایک یہ کہ آنحضرتؐ کی ایسی مدح نہیں کرنا چاہیے جس سے دوسرے انبیائے کرام کا نقص یا کمی معلوم ہو، اور اس شعر میں لم یدانوا (آپ کے قریب بھی آنے نہ پائے) کے لفظ سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ انبیائے کرام کی خدانخواستہ تنقیص ہوگئی لیکن اگر غور کیا جائے تو اس سے ان کی مطلقاً تنقیص نہیں ہوتی، اس لیے کہ بڑائی اور باعظمت چیز کے بڑاپے کو بیان کرنے کے لیے اسی کے ہم پلہ چیزوں سے نسبت دے کر بیان کیا جائے گا، اگر آپ چاند کی روشنی کو بیان کرنا چاہیں تو یہ نہیں کہیں گے کہ وہ مٹی کے دیوں یا موم بتی یا برقی قمقموں سے فائق ہے، کیونکہ یہ تو ہر شخص دیکھ رہا ہے، اور جانتا ہے، آپ کہیں گے کہ زہرہ ومشتری جیسے روشن تارے جو تاریک راتوں کو روشن رکھتے ہیں وہ بھی مقابلہ نہیں کرسکتے یا اس کے قریب نہیں جاسکتے، یا آپ

کسی بڑے دولت مند کی دولت کو واضح کرنا چاہیں تو یہ نہیں کہیں گے کہ وہ کنگالوں، بھیک منگوں سے زیادہ دولت رکھتا ہے، اگر ایسا کہیں گے تو توہین ہو جائے گی۔ آپ کہیں گے کہ فلاں فلاں راجہ مہاراجہ سے اس کی دولت بڑھی ہوئی ہے۔ اس جملہ میں کسی راجہ مہاراجہ کی توہین نہیں ہوتی۔ یہ انداز بیان ہے جس کے ذریعہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس مصرعہ میں علم اور کرم کے الفاظ آئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ انبیائے کرام علم وکرم میں آپ کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکے، کوئی نادان یہ کہہ سکتا ہے کہ حضور انورؐ تو اُمّی تھے، پھر یہ علم کی بات کیونکر کہی گئی، اور ایک حضور انور پر کیا موقوف ہے تمام انبیائے کرام ظاہری مکتب ومدرسہ کے محتاج نہیں تھے، اس کا جواب یہ ہے کہ علم تو وہ ہے جس کا سرچشمہ وحی ہے، اور جو کسی اور ذریعہ سے نہیں حاصل ہو سکتا، دنیاوی علوم تو قیاس وتجربہ سے حاصل ہوتے ہیں، مگر اصلی علم وہ ہے جو وحی کے ذریعہ ملتا ہے وہ تمام انبیائے کرام کو ملا، اور ان سب سے زیادہ رسول کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا۔ فارسی کا یہ مشہور شعر حقیقت کا ترجمان ہے:

حُسنِ یوسف، دمِ عیسٰی، یدِ بیضا داری　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ایک بزرگ کے متعلق سنا ہے کہ، فرماتے تھے کہ یہ شعر ناقص ہے، اس شعر کا تو مفہوم یہ ہے کہ تمام انبیائے کرام میں جو خوبیاں علٰحدہ علٰحدہ تھیں وہ سب آپؐ میں جمع تھیں۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام سب مل کر بھی جن کمالات کو نہ پہنچ سکے وہ کمالات اللہ تعالیٰ نے ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بخش دیے تھے، لہٰذا اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو یوں ہونا چاہیے:

آنچہ خوباں ہم ندارند تو تنہا داری

وَكُلُّهُمْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ مُلْتَمِسٌ　　غَرْفًا مِنَ الْبَحْرِ أَوْ رَشْفًا مِنَ الدِّيَمِ

(یہ سب کے سب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے طلب گار ہیں کہ آپؐ کے دریائے سخاوت سے ایک چلّو، یا آپؐ کے ابر رحمت سے ایک گھونٹ پالیں۔)

مُلتمِس طلب گار، غَرف ایک چلّو پانی، رَشف ایک گھونٹ، دیم جمع دیمۃ مسلسل بارش)

یہ شعر گزشتہ دونوں شعر سے مربوط ہے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے علم وکرم کا یہ حال ہے کہ تمام (طالبانِ ہدایت) سب کے سب درِ اقدس پر کاسۂ گدائی لیے کھڑے ہیں، جیسے آپ کی ذات پاک ایک اتھاہ سمندر ہے جس سے یہ لوگ ایک چلّو پانی کے طلب گار ہیں یا آپ کی ذات گرامی کو یوں سمجھو کہ جیسے مسلسل ابر رحمت برس رہا ہو اور سارا عالم اس سے ایک گھونٹ پانی کا خواہشمند ہے۔

وَوَاقِفُوْنَ لَدَيْهِ عِنْدَ حَدِّهِمْ　　مِنْ نُقْطَةِ الْعِلْمِ أَوْ مِنْ شَكْلَةِ الْحِكَمِ

(اور یہ تمام انبیائے کرامؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اپنی حدوں پر کھڑے ہیں، ان کی حد، علم کا ایک نقطہ ہے یا حکمت کا ایک دائرہ ہے۔)

(شَكْلَةٌ - نقطہ کے ہم معنی)

وہ علم وکرم جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیائے کرام پر فوقیت بخشی گئی ہے ان کی وسعت کا یہ حال ہے کہ انبیائے کرام ایک حد پر آکر رک جاتے ہیں جس سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتے، اور آنحضرتؐ کے مقابلہ میں ان کی جو حد ہے اس کو یوں سمجھیے کہ دفتر علم ومعرفت کا ایک نقطہ ہے یا حکمت ودانائی کا ایک دائرہ ہے۔ شیخ ابراہیم الباجوری اپنی شرح میں لکھتے ہیں کہ جہاں پر تمام انبیائے کرام کے علوم وحکمت کی انتہا ہوتی ہے وہاں سے حضور انورؐ کے علم ودانائی کی ابتدا ہوتی ہے اس شعر میں "لَدَيْهِ" کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "اس کے نزدیک" ظاہر یہی ہے کہ اس سے مراد حضور اکرمؐ ہیں کیونکہ انہی کا ذکر چلا آرہا ہے اور ان کے علم وکرم کا یہاں تین شعر پہلے سے ذکر کیا جارہا ہے، لہٰذا یہی معنی ہوئے کہ تمام انبیائے کرام آنحضرتؐ کے حضور اپنی حد پر کھڑے ہیں۔ لیکن الباجوری فرماتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ لَدَيْهِ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو کہ ان تمام انبیائے کرام کو علم وادراک کا محض ایک نقطہ حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے اور سب کے سب راہِ حق پر ثابت قدم اور فرائض رسالت کی ادائیگی میں مستعد ہیں۔ اور علم سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے جو تمام عالم پر محیط ہے اور تمام انبیاء کو جو علم عطا ہوا وہ علم الٰہی کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسے ایک نقطہ ہو علمی لحاظ سے یہ شرح زیادہ بہتر ہے مگر قصیدہ نعتِ نبویؐ میں ہے اس لیے جو معنی پہلے سمجھے گئے وہی مناسب حال معلوم ہوتے ہیں۔

فَهُوَ الَّذِيْ تَمَّ مَعْنَاهُ وَصُوْرَتُهُ　　ثُمَّ اصْطَفَاهُ حَبِيْبًا بَارِئُ النَّسَمِ

(کیونکہ آپ وہ ہیں جن کے فضائل معنوی (اخلاق و عادات) اور جن کی ظاہری شکل و شباہت درجۂ کمال پر ہیں، ان ظاہری اور باطنی اوصاف کو بخشنے کے بعد آپ کو تمام ذی روح کو حیات بخشنے والی ذات (اللہ تعالیٰ) نے اپنا حبیب منتخب کر لیا۔)

اس شعر کا وہی مفہوم ہے جو اوپر ۳۷ ویں شعر کا مطلب تھا، صرف فرق یہ ہے کہ اس شعر میں خَلق ظاہری شکل کا ذکر پہلے تھا، باطنی کمالات کی طرف اشارہ خُلق بعد میں تھا، اس میں ترتیب بدلی ہوئی ہے، اس کو بلاغت کی اصطلاح میں لَفّ و نشر مشوش کہتے ہیں) ایک بات زیادہ اس شعر میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہری و باطنی اوصاف مرحمت فرمانے کے بعد اپنا پسندیدہ حبیب بھی بنایا ہے۔

مُنَزَّهٌ عَنْ شَرِيْكٍ فِيْ مَحَاسِنِهٖ فَجَوْهَرُ الْحُسْنِ فِيْهِ غَيْرُ مُنْقَسِمِ

(آپ اپنے محاسن میں کوئی ہمسر نہیں رکھتے، آپ کی خوبیوں کا جوہر قابلِ تقسیم نہیں ہے)

مُنَزَّہ کا ترجمہ اردو میں عام طور پر "پاک" کے لفظ سے کیا جاتا ہے، اللہ شرک سے منزہ ہے یعنی پاک ہے۔ لیکن اس لفظ کا حقیقی مفہوم آجکل کی زبان و تعبیر میں یہ ہے کہ آپ اس سے بلند ہیں کہ آپ کا کوئی مدمقابل یا ہمسر ہو، آپ جیسے محاسن کسی میں نہیں پائے جاتے، اللہ نے آپ کو جو خوبیاں عطا فرمائی ہیں ان میں آپ کا کوئی شریک و ہمدم نہیں ہے، کیونکہ حسن کی وہ حقیقت جس کو "جوہر" کہتے ہیں آپ کو ایسا عطا ہوا ہے جو تقسیم ہو ہی نہیں سکتا۔

شارح علامہ الباجوری فرماتے ہیں کہ اس شعر پر ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ حضور اکرمؐ بے شک تمام انبیائے کرامؑ کے سردار اور سب سے اشرف و اعلیٰ ہیں، مگر یہ کہنا کہ آپ کا کوئی ہمسر پیدا نہیں ہوا درست نہیں کیونکہ رسالت، نبوت، معجزہ، اخلاص، عبادات، حسن اخلاق، یہ تمام باتیں دوسرے انبیائے کرام میں بھی پائی جاتی تھیں، لہٰذا آپ تنہا ان اوصاف کے وارث نہیں ہیں، اس اعتراض کا جواب بھی خود ہی دیتے ہیں کہ ان انبیائے کرام کو جو کچھ ملا سب برحق ہے، سچ ہے مگر آنحضرتؐ کے مقابلہ میں ان کی حیثیت ایسی تھی جیسے کسی ضخیم کتاب کا ایک نقطہ ہو، یا دریائے معرفت کا ایک قطرہ۔

دَعْ مَا ادَّعَتْهُ النَّصَارٰى فِيْ نَبِيِّهِمْ وَاحْكُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِيْهِ وَاحْتَكِمِ

(نصرانیوں (عیسائیوں) نے اپنے پیغمبر کے بارے میں جو دعوے کیے ہیں ان سے

پرہیز کرو، اس کے علاوہ آپؐ کی مدح میں سب کچھ کہہ سکتے ہو۔)

گزشتہ شعر میں لفظ "شریک" آیا تھا، کہ آپ کی ذات رسالت مآب اپنے محاسن میں شرک سے بری یا پاک ہے، اس سے وہم ہو سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ خدا کا ہمسر شرک سے برأت میں کہا جا رہا ہے، لہٰذا اس شعر میں اس کی وضاحت کر دی گئی کہ عیسائیوں کی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا یا خدا کا بیٹا نہ کہنا، اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات کا ہمسر نہ گردانا، نفع و نقصان کا مالک عطا کرنے والا اور سلب کرنے والا نہ سمجھنا، رزق دینے والا، مینہ برسانے والا قسمت بدلنے والا نہ سمجھنا — یہ چھوڑ کر جو مدح کے پیرائے میں کہنا چاہو کہو اور ہر حال میں اعتدال پیش نظر رہے، کیونکہ یہ سرحد بہت نازک سرحد ہے، فرطِ عقیدت و محبت میں سرحدِ الوہیت توڑنے کی ہمت نہ کرنا، بعض لوگوں نے لفظ "احتکم" ضرورت شعری کی بنا پر ایک لفظ زائد (حشو) سمجھا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اعتدال کی راہ پر قائم رہنا۔

وَانْسُبْ اِلٰى ذَاتِهٖ مَا شِئْتَ مِنْ شَرَفٍ وَانْسُبْ اِلٰى قَدْرِهٖ مَا شِئْتَ مِنْ عِظَمِ

(آپؐ کی ذات گرامی کی طرف جس شرف کو چاہو منسوب کرو، اور آپؐ کی قدر و منزلت کی جن عظمتوں کو چاہو بیان کرو (سب روا اور مستحسن ہے۔)

مفہوم واضح ہے کہ سوائے الوہیت یا تشابہ الوہیت کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام خوبیوں کے جامع اور تمام عظمتوں کے حامل ہیں، محبت و احترام اور تکریم و عظمت کی تمام باتیں ان سے منسوب کی جا سکتی ہیں۔

فَاِنَّ فَضْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَيْسَ لَهٗ حَدٌّ فَيُعْرِبَ عَنْهُ نَاطِقٌ بِفَمِ

(اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتوں کی کوئی حد نہیں ہے کہ کوئی بولنے والا اپنی زبان سے بیان کر سکے۔)

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر ما ہمچناں در اول وصفِ تو ماندہ ایم

(دفتر کے دفتر مکمل ہو گئے اور عمر بھی خاتمہ کے قریب آئی مگر ہم اب تک آپؐ کے پہلے ہی وصف (خوبی) کو بیان کر رہے ہیں۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کی کوئی انتہا نہیں ہے، یہ بات صرف جوشِ

عقیدت کی بناء پر نہیں بلکہ آیات واحادیث کی روشنی سے ثابت بھی یہی ہے، کہ جس طرح آپؐ کے کمالات دنیا میں بڑھے ہوئے ہیں اس سے زیادہ آخرت میں ترقی پذیر رہیں گے، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى"

(دنیا سے کہیں زیادہ اُخروی زندگی آپؐ کی بہتر ہے۔)

اسی لیے علماء ومفسرین کا اتفاق ہے کہ اس دنیا سے حیات ناسوتی کے منقطع ہو جانے کے بعد بھی آپ کی ترقیاتِ روحانی جاری ہیں اور تاقیامت جاری رہیں گی، لہٰذا حد اور انتہا اس شئے کی ہوتی ہے جو ایک جگہ پر رُک جائے، اور تکمیل پا جائے، مگر یہاں تو ترقی کا سفر مسلسل جاری ہے اس لیے آپؐ کی عظمتوں کی کوئی حد نہیں ہے، اور جب ایسا ہے تو آپ کی مدح میں جو کہا جائے سب روا ہے، البتہ کوئی شرک کا مضمون نہ آنے پائے الوہیت اور عبدیت کا فرق ملحوظ رہے خالق اور مخلوق کی پہچان قائم رہے۔

وَلَوْ نَاسَبَتْ قَدْرَهٗ اٰيَاتُهٗ عِظَمًا اَحْيَا اِسْمُهٗ حِيْنَ يُدْعٰى دَارِسَ الرِّمَمِ

(اور اگر عظمتوں کے اعتبار سے آپؐ کے معجزات آپ کی شان کے مطابق ہوتے تو جب آپؐ کا نام پکارا جاتا، تو وہ (یعنی آپ کا نام) مردہ کو زندہ کر دیتا۔)

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی عظمتیں اس قدر ہیں جس کا اندازہ آپؐ کے معجزات سے نہیں کیا جا سکتا اگر آپؐ کی عظمتوں کے بقدر آپؐ کے معجزات ہوتے تو جیسے ہی آپؐ کا نام لیا جاتا مردے زندہ ہو جاتے مگر ایسا نہیں ہے۔

اس شعر میں عربی جاننے والے حضرات محسوس کرلیں گے کہ ناسبت کا فاعل مؤخر اٰیاتہ ہے اور مفعول مقدم قدرہ ہے۔ دارس الرمم کے معنی وفات پائے ہوئے لوگ کے ہیں۔ دارس جانے والے، مٹ جانے والے۔ رمم جمع رمۃ پرانی ہڈی، ہڈی، یعنی وہ لوگ مٹی میں مل گئے اور ان کی ہڈیاں بھی پرانی ہو گئیں۔

واضح رہے کہ پیدا کرنا اور مارنا، زندگی بخشنا اور حیات سلب کرلینا محض اللہ کا کام ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بطور حجت کے معجزہ کے طور پر یہ اجازت دی گئی تھی کہ جس کو اللہ چاہے اس کو وہ قُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ اللہ کے حکم سے اٹھ جا، کہہ سکتے تھے، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی مخلوق اور

اللہ کے بندے تھے، ان کو محض معجزہ کے طور پر ایک وقت کے لیے یہ صلاحیت دی گئی تھی۔ ہمارے حضور اکرمؐ کو یہ معجزہ نہیں عطا ہوا، اس کا سبب یہ تھا کہ اس سے کم درجہ کے معجزات پر لوگ قائل ہو گئے دوسرے یہ کہ معجزات عظمت کا پیمانہ نہیں ہیں کہ کسی نبی کا درجہ اس کے معجزات سے ناپا جائے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ اگر اس کے مطابق معجزے دیے جاتے تو کم سے کم مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ ضرور ہوتا۔ ایک خاص بات یاد رکھنے کے لائق یہ ہے کہ معجزات پیغمبر کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ امتِ دعوت کی ضرورت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے قرآن کا معجزہ قیامت تک کے لیے کافی ہو گیا، اور حضرت عیسیٰ کی امت کے لیے مردہ کو زندہ کرنے کا بھی معجزہ کافی نہیں ہوا، اور ان کی قوم نے اپنی دانست میں ان کو سولی ہی پر چڑھا دیا اور ان کے دین کو اتنا مسخ کر دیا کہ 'خلعتِ الوہیت' پہنا کر فرزند خداوندگار کا لقب دیا۔

لَمْ يَمْتَحِنَّا بِمَا تَعْيَا الْعُقُوْلُ بِهٖ حِرْصًا عَلَيْنَا، فَلَمْ نَرْتَبْ وَلَمْ نَهِمِ

(رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے) ہمیں آزمائش یا امتحان میں نہیں ڈالا جس کے فہم وادراک سے انسانی عقول عاجز رہ جاتیں، اس امتحان نہ لینے کا سبب یہ تھا کہ آپ کو ہماری ہدایت کی بڑی فکر تھی، چنانچہ ہم نہ شکوک میں مبتلا ہوئے اور نہ راہ سے بھٹکے۔)

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایت لے کر آئے وہ خالص انسانی مذاقِ سلیم اور فطرتِ انسانی کے مطابق ہے، اس میں نہ محیر العقول قسم کے معمے اور ناقابلِ عمل قسم کے مجاہدات کا حکم ہے کہ انسان کی فہم اور قوت سے بالا امتحان ہو تا جس پر دو چار ہی پورے اترتے یا بالکل کوئی انسان بھی کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف آپؐ جو دین لے کر آئے وہ عملی ہے، سمجھ میں آنے والا ہے اور ہر شخص کے لیے قابل عمل ہے، کوئی فکر یا کوئی عقل خواہ کسی پیمانے کی ہو، سب اس کو سمجھ سکتے ہیں، کوئی پیچیدہ فلسفہ نہیں ہے جس کو چند بہت اعلیٰ درجے کے ذہین انسان تاویلوں کے ذریعہ سمجھ سکیں اور پوری انسانی آبادی اس کے فہم سے عاری ہو۔ بلکہ ایک سیدھا سادا طریقہ ہے جس کو عرف میں مذہب یا راستہ کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور بالکل صحیح ارشاد ہے کہ:

ترکتم علی المحجة البیضاء لیلها کنهارها۔ (ہم نے تم کو ایسے راستہ

پر لگایا ہے جو اتنا روشن اور صاف ہے کہ اس کی راتیں بھی اس درجہ درخشندہ ہیں جیسے اس کے دن۔)

اسی لیے اس دین کو دینِ حنیف بھی کہتے ہیں کہ سیدھا، قابلِ فہم، قابلِ عمل دین ہے۔ لہٰذا شاعر حضرت بوصیریؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ احسان ظاہر کر رہے ہیں کہ آپؐ نے ہمیں دین پر لگایا جس کے قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہمیں کسی امتحان سے نہیں گزرنا پڑا اور نہ ہم شک میں مبتلا ہوئے اور نہ راہ سے بھٹکے۔

أَعْيَا الْوَرىٰ فَهْمُ مَعْنَاهُ فَلَيْسَ يُرىٰ ... لِلْقُرْبِ وَالْبُعْدِ فِيْهِ غَيْرُ مُنْفَحِمِ

كَالشَّمْسِ تَظْهَرُ لِلْعَيْنَيْنِ مِنْ بُعُدٍ ... صَغِيْرَةً وَتُكِلُّ الطَّرْفَ مِنْ أَمَمِ

(جہاں تک دین کا معاملہ ہے وہ تو قابلِ فہم اور قابلِ عمل ہے اس میں کوئی بات گنجلک یا معمہ کی قسم کی نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک آپ کی ظاہری و باطنی بلندیوں کا تعلق ہے اس کی تہہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اسی مفہوم کو بوصیریؒ اس طرح فرماتے ہیں:
"آپ کی حقیقت کو سمجھنے سے سارا عالم قاصر ہے، آپ نزدیک یا دور سے جس طرح بھی دیکھے گئے لوگ آپؐ کی علوِ مرتبت کو سمجھنے سے عاجز ہی رہے، جیسے آفتاب دور سے دیکھا جائے تو چھوٹا سا نظر آتا ہے مگر قریب سے دیکھا جائے تو آنکھ عاجز و درماندہ رہے۔)

لفظی تشریحات: (أعيا درماندہ کردیا۔ وَرىٰ دنیا، منفحم جواب سے عاجز ہو جانا افحم بند کردیا۔ یعنی کسی کو لاجواب کردیا۔ تکلّ۔ کلّ یکلّ سے تھکا دینا۔ أَمَم قریب۔)

چند اشعار میں اوپر یہ کہا گیا تھا کہ آپؐ کی مدح سے زبان عاجز ہے، اسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں کہتے ہیں کہ دنیا نے آپؐ کی عظمت کا اندازہ نہیں لگایا کیونکہ وہ نگاہ ہی دنیا میں نہیں ہے جو آپؐ کی باطنی عظمت کا احاطہ کر سکے۔ قریب سے دیکھنے والے اور دور سے دیکھنے والے کوئی بھی صحیح عظمت کے معیار کو نہ پا سکے، جیسے آفتاب ہے، دور سے دیکھو تو ایک آئینہ یا ڈھال کی طرح نظر آتا ہے مگر وہ حقیقت میں جس قدر بڑا ہے دور سے دیکھنے والا نہیں سمجھ سکتا اور قریب سے کوئی دیکھنے کی کوشش کرے تو آنکھ نہیں ٹھہر سکتی۔

وَكَيْفَ يُدْرِكُ فِي الدُّنْيَا حَقِيْقَتَهُ ... قَوْمٌ نِيَامٌ تَسَلَّوْا عَنْهُ بِالْحُلُمِ

(وہ خوابیدہ افراد آپؐ کی حقیقت کا کہاں ادراک کر سکتے ہیں جو صرف خواب میں آپؐ کو دیکھ کر تسلی حاصل کر لیتے ہیں۔)

یہ شعر دراصل ماقبل شعر کی تائید کرتا ہے، کَيْفَ يُدْرِكُ قَوْمٌ نِيَامٌ خوابیدہ لوگ کہاں ادراک کر سکتے ہیں؟ استفہام انکاری ہے، یعنی دنیا کے رہنے والے آپ کی حقیقت کا مرتبہ پہچان ہی نہیں سکتے، صرف خواب میں دیکھ کر دل کو تسلی دے سکتے ہیں۔

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کے عنداللہ درجات کا ادراک اور آپ کے مقامِ عالی کی معرفت اس دنیا میں ناممکن ہے وہ تو قیامت کے روز ہی معلوم ہوگی، کیونکہ اولاً دنیا بذاتِ خود غفلت اور نیند میں مبتلا ہے، حدیث شریف میں ہے:

الناس نيام فإذا ماتوا انتبهوا

(لوگ سب نیند میں ہیں، جب مریں گے تو ہوش میں آجائیں گے۔)

لہٰذا اس شعر میں قوم سے مراد ساری دنیا کے لوگ ہیں، خواب میں دیکھ کر تسلی پا جاتے ہیں۔ خواب میں دیکھنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ واقعی کسی کو یہ سعادت حاصل ہو کہ خواب میں آپؐ کا دیدار اسی کو نصیب ہو، حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس نے مجھے خواب میں بھی دیکھا اس نے مجھ ہی کو دیکھا (من رآني فقد رآني حقاً) اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ خواب میں جس نے آپؐ کو دیکھا اس نے واقعی آپؐ ہی کو دیکھ لیا کیونکہ شیطان آپؐ کی شبیہ اختیار نہیں کر سکتا، اس سلسلہ میں بعض علماء کا رجحان یہ ہے کہ جس نے آپؐ کو اس ہیئت اور شبیہ میں دیکھا جو آپؐ کی تھی تو اس نے بے شک آپؐ کو دیکھا، مگر جس نے کسی دوسری ہیئت میں دیکھا وہ خواب معتبر نہیں ہے، مزید یہ کہ خواب ایک مومن محبِ صادق کا خواب معتبر ہے، کفار و مشرکین اور معاندین اگر دعویٰ کریں تو وہ ان کے تصورات کا پرتو ہوگا اور ان کے معاندانہ اوہام کی تصویر ہوگی۔ اس شعر کی تشریح میں اگر زیادہ گہرے جائیے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپؐ کے دنیاوی وجود کو دیکھنے والے بھی اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے خاص کر رکھا ہے، جہاں کسی نبی مرسل یا ولی مقرب کی رسائی نہیں ہے، اور انہوں نے اگرچہ آپؐ کو دیکھا مگر آپؐ کے اصلی مرتبہ کو نہیں جان سکے جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے جس نے ان کو یہ مرتبہ بخشا ہے، اور ان کا دیکھنا بھی ایسا ہے جیسے کوئی خواب دیکھے:

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

فَمَبْلَغُ الْعِلْمِ فِيهِ أَنَّهُ بَشَرٌ وَأَنَّهُ خَيْرُ خَلْقِ اللّٰهِ كُلِّهِمِ

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں انتہائی معلومات یہ ہیں کہ آپؐ بشر ہیں، اور یہ کہ آپ اللہ کی کل مخلوقات سے بہتر ہیں۔)

آپؐ کا بشر ہونا ذات اور شخصیت کی بناء پر ہے اور تمام انسانوں میں اعلیٰ اور افضل ہونا باعتبار صفت کے ہے، انسان کو جو علم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس کی رو سے اس کے فہم کی پرواز جہاں تک جا سکتی ہے اس کے مطابق آپؐ کی اصل یہی ہے کہ آپؐ بشر ہیں، اور قرآن کریم میں آپؐ کا بشر ہونا بار بار واضح کیا گیا ہے، اور آپؐ سے پہلے جتنے انبیاء گزرے ہیں ان کی قرآن نے محاکات یہی کی ہے کہ انھوں نے اعلان کیا کہ میں تم ہی جیسا ایک انسان ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بے شک ایک بشر ہی تھے اور اللہ کے بندہ اور رسول برحق تھے، اگر بشر سے ماسوا ہوتے تو کمالِ خلق اور معجزانہ سیرت کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔ دوسرے یہ کہ آپؐ پھر انسانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ نہیں بن سکتے تھے، لوگ کہتے کہ یہ اخلاق و عادات تو اس ذات کے ہیں جو بشریت سے ماسوا ہے اور ہم بشر ہیں کس طرح آپؐ کو نمونہ بنا سکتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیائے کرام کو انسانوں میں پیدا کیا، ان کی پیدائش، دنیا سے وفات، مرض کی تکلیف، فاقہ کی مشقت، نکاح کی ضرورت، رزق میں تنگی اور وسعت، سب اسی طرح آپؐ پر بھی گزاری گئیں جو بشریت کا لازمہ ہیں، اگر فرشتے نازل کیے جاتے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ ان کو تو اللہ تعالیٰ نے بشری ضروریات سے بلند اور پاک رکھا ہے بھلا وہ کیا ہمارے درد دکھ کو جانیں، لہٰذا ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم بھی بشر ہی تھے اور اس لباس بشریت میں رہ کر آپؐ نے ایسا اعلیٰ وارفع نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جو کوئی دوسرا نہیں پیش کر سکا اور اللہ کا بندہ ہونا آپؐ کی شان کے مطابق ہے اور ایک بڑی مدح بھی ہے، کیونکہ حق عبدیت آپؐ نے ادا کیا، رسالت کی امانت انسانوں تک پہنچا دی، شیخ بوصیریؒ اپنے ایک شعر میں پہلے کہہ چکے ہیں کہ تم اپنے نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و نعت ضرور کرو مگر اعتدال پر قائم رہو، ان کو عیسائیوں کی طرح خدا کا بیٹا نہ کہنا، یعنی ماورا بشریت ان کے لیے درجہ نہ تجویز کرنا۔ اس شعر سے وہم ہوتا ہے کہ وہ اس سے متعارض بات کہنا چاہتے ہیں کہ لوگوں کا علم تو بس اسی قدر ہے کہ آپ بشر ہیں اور تمام انسانوں سے افضل ہیں، مگر.... ؟ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ وہ کچھ اور

درجہ تجویز کرنا چاہتے ہیں لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسانی مبلغ علم یہی ہے کہ آپؐ بشر اور تمام مخلوقات سے افضل ہیں، اب اس کے بعد جو آپؐ کے درجات عند اللہ ہیں وہ ہم نہیں جان سکتے اور نہ ہم اس کا احاطہ کر سکتے ہیں، وہ صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

وَكُلُّ آيٍ أَتَى الرُّسُلُ الْكِرَامُ بِهَا فَإِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُورِهِ بِهِمِ

فَإِنَّهُ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا يُظْهِرْنَ أَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِي الظُّلَمِ

(تمام انبیائے کرام جو بھی معجزات لائے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے ان تک پہونچے — کیونکہ آپؐ فضل و کمال کے آفتاب ہیں، اور انبیاء اس کے کواکب ہیں جو اپنی روشنی انسانوں کو تاریکیوں میں دکھلاتے رہے۔)

مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو سرتاپا نور بنا کر بھیجا، اور نور (روشنی) کے جتنے ذرائع ہیں ان میں آپؐ کی حیثیت ایک آفتاب کی ہے۔ ان دو شعروں میں حضرت بوصیریؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آفتاب بھی ایک جرم ہے، ستارے بھی اجرام سماوی ہیں، مگر دونوں میں فرق ظاہر ہے، اسی طرح آپؐ بھی بشر ہیں، اور تمام انبیائے کرام بھی بشر ہیں، اور سارے انسان بشر ہیں، لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ نے آفتاب کو تمام اجرام سماوی پر فوقیت دی ہے اسی طرح تمام انسانوں میں آپؐ کو ممتاز بشر بنا کر بھیجا۔ اس کو یوں سمجھیے کہ ایک دیا بھی روشنی کا آلہ ہے، قندیل بھی روشنی کا ذریعہ ہے، تارے بھی روشنی پہنچاتے ہیں اور آفتاب بھی روشنی پہنچاتا ہے، لہٰذا یہ تو سب کہتے ہیں کہ مٹی کا دیا جو تیل سے جلتا ہے اور آفتاب جو دنیا کو روشن کرتا ہے، دونوں روشنی پہنچانے کے ذرائع ہیں اور اس صفت میں یکساں ہیں۔ لیکن جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

دوسری بات جو شارح البا جوریؒ نے لکھی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو نور کامل بنایا اور آپؐ سے پہلے جتنے انبیائے کرام گزرے ہیں سب کو اس آفتاب ہدایت سے مربوط رکھا ہے، اور انبیائے سابقین جو معجزات لائے وہ سب کے سب آپؐ کے نور کا پرتو تھے۔ دوسرے شعر میں تاریکیوں 'ظُلَم' کا لفظ آیا ہے، اس کا مطلب کفر ہے، یعنی کفر کی اندھیاریوں میں انبیائے کرام جو ہدایت کی روشنی لے کر آئے، وہ تمام روشن کرنے والی ہدایتیں ایسی تھیں جیسے آفتاب کے مقابلہ میں تاروں کی روشنی ہو۔

أَكْرِمْ بِخَلْقِ نَبِيٍّ زَانَهُ خُلُقٌ بِالْحُسْنِ مُشْتَمِلٍ بِالْبِشْرِ مُتَّسِمِ

(کیا عظمت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال ظاہری کی جس کو آپ کے اخلاق نے چار چاند لگا دیے، سارا حسن آپؐ کی ذات گرامی میں جمع ہے اور آپؐ کی خندہ پیشانی آپؐ کے جمال جہاں آراء کا جزء ہے، یعنی ہمیشہ آپؐ کو بشاش وخندہ دیکھا گیا۔)

یہ مضمون پہلے بھی ایک شعر میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہری جمال بھی کمال کا عطا فرمایا تھا، اور حُسن اخلاق میں بھی آپؐ کو بے مثال بنایا ہے۔ اس شعر میں آپؐ کے جمال ظاہری کی مزید ایک صفت بتا رہے ہیں کہ آپؐ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملا کرتے تھے اور چہرۂ مبارک ہمیشہ ہشاش وبشاش رہتا تھا، عربی داں حضرات جانتے ہیں کہ اَکْرِمْ فعل تعجب کہا جاتا ہے جو کسی ایسی عظمت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جہاں الفاظ کفایت نہیں کرتے، جیسے اردو میں کہیں: "کیا کہنا ہے آپ کے حُسن وجمال کا" یا اسی طرح کہتے ہیں "آپ کے سرتاپا جمال کی عظمت کا کیا کہنا ہے"۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ کَانَ اَحْسَنَ النَّاسِ خَلْقاً آپؐ تمام انسانوں میں سب سے زیادہ حسین وجمیل تھے۔ ایک فارسی کا شعر ہے:

اکنوں توئی جمیل جہاں گرچہ پیش ازیں
آوازۂ جمال زکنعاں بر آمدہ

یعنی آپؐ اپنے عہد میں سب سے زیادہ حسین وجمیل ہیں اگرچہ آپؐ سے پیشتر حسن کا شہرہ کنعان سے اٹھا تھا، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن مشہور تھا۔

جہاں تک حسن اخلاق کا تعلق ہے اس پر قرآن ناطق ہے: وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (اور اخلاق آپؐ کے بہت عالی ہیں)۔ (سورۂ قلم)

كَالزَّهْرِ فِي تَرَفٍ وَالْبَدْرِ فِي شَرَفٍ ۔۔۔ وَالْبَحْرِ فِي كَرَمٍ وَالدَّهْرِ فِي هِمَمٍ
كَأَنَّهُ وَهُوَ فَرْدٌ مِنْ جَلَالَتِهِ ۔۔۔ فِي عَسْكَرٍ حِيْنَ تَلْقَاهُ وَفِي حَشَمٍ

(وجود گرامی) صباحت میں جیسے کلی، اوج ورفعت میں جیسے چودہویں کا چاند، سخاوت میں جیسے دریا اور ہمت وپامردی میں جیسے زمانہ۔)

(جب بھی آپؐ سے ملیے، آپؐ ایک فوج کے درمیان ہوں یا خدام کے جھرمٹ میں

ہوں، اپنی جلالت شان سے تن تنہا سب پر بھاری اور سب میں ممتاز نظر آئیں گے۔ گویا کہ آپؐ ہی ہیں اور کوئی نہیں ہے۔ (عربی داں حضرات کے لیے: کانہ فرد من جلالتہ وھو فی عسکر حین تلقاہ وفی حشم)

ان دونوں شعر کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال جہاں آراء کو اگر تشبیہ دی جائے تو جہاں تک چہرۂ انور کا تعلق ہے وہ اپنی صباحت میں کلی کے مانند ہے، اوج ورفعت اور ضیا بخشی میں مثل ماہتاب کے ہے اور جہاں تک عادات وفضائل کا تعلق ہے آپؐ کی سخاوت مثل دریا کے ہے، سخاوت کے لیے دریا کی تشبیہ اس لیے دیتے ہیں کہ اس سے انسان، حیوان، چرند، پرند ہر شخص بقدر ضرورت پانی لیتا ہے، دریا کی روانی کم نہیں ہوتی، اور دریا سے صرف پانی ہی نہیں بلکہ کھانے کے لیے مچھلیاں اور زینت کے لیے موتی بھی نکلتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

"وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا۔"

(اور وہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے اختیار میں کیا تاکہ اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زیور (موتی وغیرہ) نکالو جسے تم پہنتے ہو۔ (۱۶/۱۲)

'صباحت' میں نے تَرَفَ کا ترجمہ کیا ہے، اصل ترجمہ اس لفظ کا نرمی ہے ملائم ہونا جیسے کلی نرم وملائم ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک اس درجہ نرم تھے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ما مست حریرًا ولا دیباجًا ألین من کف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(میں نے نبی کریمؐ کے دست مبارک سے زیادہ نرم ریشم کو ملائم پایا اور نہ دیباج (ایک نرم کپڑا) کو۔)

والدھر فی ھمم کا مطلب یہ ہے کہ ہمت وپامردی، شدائد کا مقابلہ کرنے میں آپؐ کی مثال دھر (زمانہ) کی جیسی تھی، عرب قدیم عقائد کی بنا پر مصائب وشدائد اور نعمت واقبال مندی سب کی نسبت زمانہ کی طرف کرتے تھے، جیسے فارسی اور اردو کے شعراء آسمان کو مصائب وشدائد کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، کسی مصیبت زدہ کو کہتے ہیں "فلک گزیدہ" ہے، آسمان ظلم ڈھا رہا ہے، یہ بات اسلامی

عقیدہ کے لحاظ سے غلط ہے کیونکہ آسمان اور زمین سب اللہ کی مخلوق ہیں کسی میں طاقت نہیں کہ کسی کو نقصان یا فائدہ پہونچا سکیں، البتہ اس کی ایک تاویل یہ ہے کہ ظرف بول کر مظروف مراد لینا ایک عام طریقہ ہے، چونکہ خوش حالی اور بدحالی، سختی اور نرمی کا مشاہدہ ہم زمانہ کے بدلنے سے کرتے ہیں، اس لیے زمانہ کی طرف ان امور کی نسبت کر دیا کرتے ہیں۔ عربی میں بھی اس کی مثال ہے جیسے کہیں نھارہ صائم لیلہ قائم ظاہر ہے کہ دن روزہ نہیں رکھتا، رات کھڑی نہیں رہتی، دن میں روزہ رکھا جاتا ہے، رات کو قیام کیا جاتا ہے مگر یہ بولنے کا ایک طریقہ ہے۔ بوصیریؒ اپنے ممدوح پاکؐ کے بارے میں کہتے ہیں کہ آپ کی ہمت و شجاعت ایسی تھی جیسے زمانہ ہو — جو ہر وار برداشت کر لیتا ہے، اور اپنی جگہ سے ہلتا نہیں ہے۔

دوسرا شعر، عربی ترکیب کے لحاظ سے، ذرا پیچیدہ سا ہے، کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آپؐ کو بڑے سے بڑے مجمع میں دیکھو ہر ایک کی نگاہ آپؐ ہی پر پڑتی ہے، خدام ہوں یا عساکر ہر مجلس یا ہر مجمع میں آپؐ اپنی جلالتِ شان سے تنہا ہی نظر آتے ہیں۔

كَأَنَّمَا اللُّؤْلُؤُ الْمَكْنُونُ فِي صَدَفٍ ... مِنْ مَعْدِنَيْ مَنْطِقٍ مِنْهُ وَمُبْتَسَمِ

لَا طِيبَ يَعْدِلُ تُرْبًا ضَمَّ أَعْظُمَهُ ... طُوبَى لِمُنْتَشِقٍ مِنْهُ وَمُلْتَثِمِ

(دندان مبارک) گویا کہ موتی ہیں جو صدف میں ہوں، ان موتیوں کا معدن گفتگو اور تبسم ہے، کوئی خوشبو اس مٹی کی برابری نہیں کر سکتی جس مٹی نے آپؐ کی ہڈیوں کو اپنی آغوش میں لیا ہے، مبارک ہو اس شخص کو جس کو اسی مٹی کی خوشبو نصیب ہو یا اس کے چومنے کی سعادت ملی ہو۔)

پہلے شعر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لب و دندان کو ان موتیوں سے تشبیہ دی ہے جو اپنی سیپوں (صدف) میں محفوظ ہوں اور ان کو گفتگو اور تبسم فرمانے کے وقت دیکھا جاتا ہے۔

دوسرے شعر میں آپؐ کی تربتِ پاک کی مٹی کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ مٹی جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جسد مبارک محفوظ ہے۔ اس کی خوشبو کا مقابلہ دنیا کی کوئی خوشبو نہیں کر سکتی۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ جن کو ان کے سونگھنے یا چومنے کا موقع ملے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ماشممت عنبرًا ولا مسکا ولا شیئًا اطیب من ریح رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔

(میں نے عنبر، مشک اور دنیا کی کوئی ایسی خوشبو نہیں سونگھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاس پاک سے زیادہ عطر بیز ہو۔)

شیخ باجوریؒ نے اس مصرعہ پر کہ "خوش نصیب ہے وہ جو اس مٹی کو سونگھے یا چومے" کی ایک اور شرح نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ طوبیٰ سے مراد جنت کا درخت ہے جس کے متعلق احادیث میں وارد ہے کہ اس کے سایہ میں سوار ایک سو برس تک چلتا رہے گا، یعنی اس درجہ گھنا سایہ دار درخت ہے اس کے بعد کا لفظ لمنتشق میں حرف ل تبیین وضاحت کے لیے ہے، منتشق سونگھنے کی جگہ، یعنی بینی (ناک) اور ملتثم مغفر پہننے کی جگہ یعنی چہرہ، لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ جنت کا سایہ دار درخت طوبیٰ آپ ہی کی بینی (ناک) اور چہرۂ انور کا مظہر ہے۔ یہ تاویل اس لیے کی جا رہی ہے کہ شیخ بوصیریؒ پر یہ الزام نہ آئے کہ انھوں نے 'قبر چومنے' یا قبر کی مٹی سونگھنے کو روا رکھا ہے، کیونکہ شرعاً یہ مکروہ ہے۔ لیکن عربی جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ مفہوم پہنانا محض دور کی تاویل ہے جو سیاق و سباق سے مختلف ہے، شیخ بوصیریؒ نے سونگھنے اور چومنے ہی کو سعادت کی بات کہا ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ امر فرطِ محبت میں جائز ہوگا، ہمیں بجائے اپنا عقیدہ اور خیال بیان کرنے کے شاعر کی ترجمانی کرنا چاہیے۔

أَبَانَ مَوْلِدُهُ عَنْ طِيبِ عُنْصُرِهِ ... يَا طِيبَ مُبْتَدَإٍ مِنْهُ وَمُخْتَتَمِ

(ولادت باسعادت نے آپؐ کے خاندانی شرف و طہارت کو ظاہر کر دیا۔ کیا کہنے ہیں آپؐ کی ابتداء اور آپؐ کی انتہاء کے۔)

اس شعر میں ان معجزات کی طرف اشارہ ہے جو آپ کی پیدائش سے ماقبل اور پیدائش کے روز ظاہر ہوئے، اگرچہ ان روایات کی صداقت مؤرخینِ اسلام اور سیرت نگارانِ نبویؐ کے نزدیک صحیح نہیں ہے، مثلاً یہ روایت کہ پیدائش سے پہلے ایک فرشتہ نے آپؐ کی والدۂ ماجدہ کو ایک گائے دودھ کا لاکر پیش کیا اور پیدائش کے وقت ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے زمیں بوس ہو گئے، دریائے ساوہ خشک ہو گیا۔ بوصیریؒ کے شارحین نے انہی روایات کی طرف اشارہ کیا ہے جس کو

قسطلانی کے حوالہ سے الروض الأنف میں نقل کیا گیا ہے، چونکہ ان روایات کی صحت بہت زیادہ مشکوک ہے اس لیے علامہ شبلی نعمانیؒ نے سیرۃ النبی کی مشہور تحریر ظہور قدسی میں اس طرح اس کی تردید کی ہے کہ غلط روایات پر اعتماد کرنے والوں کو بھی بُرا نہ لگے۔ مولانا فرماتے ہیں :

" ارباب سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ : "آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہوگیا۔" لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے، آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتشکدۂ کفر، آذرکدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بُت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔"

اس شعر میں آپ کے شرف خاندانی کی طرف اشارہ ہے جس کو "عُنصر" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اس سے مراد بنی ہاشم کا خاندان ہے، بعض شارحین کا رجحان یہ ہے کہ اس سے نسب ذکی از آدم مراد ہے کہ ثابت شدہ صحیح نسل سے پاکیزہ خاندانوں سے گزرتا ہوا آپؐ کا خاندان بنی ہاشم تک اور ان سے حضرت عبداللہ تک پہنچا، اور جہاں تک آپؐ کی پاکیزہ ابتداء کا تعلق ہے اور پاکیزہ ترانتہا کا موضوع ہے اس میں آج تک کسی کو حرف رکھنے یا زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے، اس شعر میں بلاغت کی صنعت تکرار (طیب) اور صنعت مراعاۃ النظیر مبتدا و مختتم قابل تحسین ہے۔

يَوْمَ تَفَرَّسَ فِيْهِ الْفُرْسُ اَنَّهُمُ قَدْ اُنْذِرُوْا بِحُلُوْلِ الْبُؤْسِ وَالنِّقَمِ

(ولادت باسعادت کا وہ دن تھا جس میں اہل فارس (کے مجوسیوں) نے تاڑ لیا تھا کہ نکبت و مصیبت کے آنے کا وقت آگیا ہے۔)

یہ بھی اسی روایت کا ایک ٹکڑا ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ ولادت نبوی کے زمانہ میں، یا اسی وقت آتشکدۂ فارس بجھ گیا تھا، اس شعر میں براہ راست یہ نہیں کہا گیا ہے مگر اشارہ اسی طرف ہے مطلب یہ ہے کہ ان کے علماء اور نجوم دانوں نے پیشن گوئی کر دی تھی کہ آج ایسا ستارہ روشن ہوا ہے جس سے ان کا زوال ہو جائے گا، اور ان کے رسم و رواج کو نیست و نابود کرنے والی ہستی اس دنیا

وَبَاتَ اَيْوَانُ كِسْرٰى وَهُوَ مُنْصَدِعٌ كَشَمْلِ اَصْحَابِ كِسْرٰى غَيْرَ مُلْتَئِمِ

[بات : أمسى۔ شمل جمع۔ ملتئم من الإلتيام : رأب الصدع]

(ایوان کسریٰ، کسریٰ والوں کے متحدہ گروہ کی طرح ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ایسا شکستہ ہوا جو جوڑا نہیں جا سکتا۔)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے وقت جو معجزات سامنے آئے [جیسا کہ بعض لوگوں نے بیان کیا ہے، اور جس کی تاریخی تحقیق نہیں ہے] ان میں یہ بھی ہے کہ اس سب ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے تھے۔ اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے مگر کنگرے گرنے اور ان کی تعداد کا ذکر نہیں ہے، صرف یہ کہتے ہیں کہ اس رات یہ ایوان اس طرح گر کر بکھر گیا جیسے اہل کسریٰ یا کسریٰ کی فوج جو پہلے ایک مضبوط و متحد محاذ تھا، آپس میں وہ لوگ لڑ کر ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے اور متحد ہونے کی صورت میں جو ان کا رعب تھا اور ان کی وہ کیفیت جو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند دکھائی دیتی تھی، ختم ہو گئی، حضرت بوصیریؒ فرماتے ہیں جس طرح کسریٰ کی فوج تتر بتر ہو گئی اسی طرح آج کی شب شاہِ کسریٰ کا ایوان بھی منہدم ہو گیا اور ایسا منہدم ہوا کہ ان کے اجزا آپس میں جوڑ کر پھر سے کھڑے نہیں کیے جا سکتے : ایوان فارسی کا وہ لفظ ہے جو عربی میں قبول کر لیا گیا ہے، بارہ دری قسم کا دالان جس کے چاروں طرف یا دو طرف کھلے ہوئے ہوں اور اوپر چھت ہو، عموماً شاہانِ وقت کا تخت ایسی ہی جگہوں پر رکھا جاتا تھا : شَمْل مجموعہ یا گروہ یا افراد کی متحدہ طاقت کو کہتے ہیں۔ حدیث سے ماخوذ دعائے قنوت میں حملہ آور کفار کے لیے کہا جاتا ہے : اَللّٰهُمَّ شَتِّتْ شَمْلَهُمْ (اے اللہ ان کی گروہی قوت کو بکھیر دے۔)

وَالنَّارُ خَامِدَةُ الْاَنْفَاسِ مِنْ اَسَفٍ عَلَيْهِ وَالنَّهْرُ سَاهِي الْعَيْنِ مِنْ سَدَمِ

(اور اس موقع پر آگ کی سانسیں (انفاس آتش) بہ سبب غم کے رک گئیں، اور نہر رنج و الم کے مارے ایک کھلی اور جاگی ہوئی آنکھ کی طرح رہ گیا۔)

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اس رات مجوسیوں کا آتشکدہ ٹھنڈا پڑ گیا، وہ آتشکدہ جس میں شعلے ہمیشہ بھڑکتے رہتے تھے، اور غم سے نہر (فرات) ایسا خشک ہوا جیسے کسی کی خشک آنکھ پھٹی کی پھٹی رہ جائے کہ یہ کیا ہو گیا؟ یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اس رات آتشِ مجوسیت ٹھنڈا پڑ گیا اور

دریائے ساوہ خشک ہوگیا، الباجوریؒ نے اپنی شرح میں لکھا ہے کہ یہاں نہر سے مراد فرات ہے، اس شعر میں دو استعارے ہیں آگ کے ٹھنڈے پڑنے کے لیے اس کی سانسوں کا رک جانا، اور خشک ہونے کے لیے آنکھوں کا خشک ہوکر کھلا رہنا، عربی میں خمد کے معنی ہیں شعلوں کی بھڑک کا ختم ہوجانا، بالکل بجھ جانے کے لیے همد بولتے ہیں۔ مگر یہاں پر شاعر حضرت بوصیری کی مراد آگ کا بجھ جانا ہی ہے، سَدَم (هَمٌّ مع الندم) حسرت وغم۔

وَسَاءَ سَاوَةَ أَنْ غَاضَتْ بُحَيْرَتُهَا وَرُدَّ وَارِدُهَا بِالْغَيْظِ حِيْنَ ظَمِيْ

(ساوہ کے لوگوں کو ان کی نہر کا خشک ہوجانا بہت سخت محسوس ہوا، جب کہ پانی پینے، پلانے والے غم وغصہ میں بھرے (نامراد) واپس گئے۔)

"ساوہ" ایک بستی کا نام ہے جو ہمدان اور رَے کے درمیان واقع ہے، یہاں کے لوگ جس دریا سے پانی لیتے تھے وہ اس رات خشک ہوگیا تھا، لہٰذا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ساوہ نامی بستی کی نہر بھی خشک ہوگئی، اور وہاں کے باشندوں نے جب اپنی نہر کو خشک پایا تو بہت غضب ناک ہوگئے، یہ وہی ساوہ ہے جس کو اردو میں 'دریائے ساوہ' (دال کے ساتھ) لکھا گیا ہے، ممکن ہے (و) اور (د) کے درمیان تشابہ ہوگیا ہو، قلمی کتابوں میں تصحیف[1] بہت ہوتی ہے، مگر باجوری کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرف واؤ ہے نہ کہ دال۔ عربی ترکیب کے لحاظ سے سَاءَ (ماضی) کا فاعل "أَنْ غَاضَتْ بُحَيْرَتُهَا" ہے اور مفعول مقدم سَاوَةَ ہے جو ایک بستی کا نام ہے مگر مقصود اہل بستی ہیں جیسے قرآن کریم میں ہے "وَاسْأَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا" (اس گاؤں سے پوچھ لیجیے جہاں ہم تھے۔) یعنی گاؤں والوں سے معلوم کرلیجیے۔ یہاں بھی یہی کہنا ہے کہ بستی ساوہ کو نہیں بلکہ اس بستی میں رہنے والوں کو بُرا لگا۔

كَأَنَّ بِالنَّارِ مَا بِالْمَاءِ مِنْ بَلَلٍ حُزْنًا، وَبِالْمَاءِ مَا بِالنَّارِ مِنْ ضَرَمِ

(غم سے گویا آگ میں وہ بات ہے جو پانی کی تری میں ہے، اور پانی میں وہ کیفیت ہے جو آگ میں گرمی کی ہے۔)

---

[1] کتابت میں بعض حروف غلط لکھ جاتے ہیں۔ قلمی کتابوں میں اس طرح کی غلطیوں کو تصحیف کہتے ہیں۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آتش مجوسیت ایسا سرد ہوا کہ گویا اس میں پانی کی خاصیت آگئی، اور دریائے ساوہ ایسا خشک ہوا کہ جیسے آگ کا تنور بن گیا۔

غم سے مراد یہ ہے کہ جب دریا سے اس کی روانی اور آتش سے اس کی گرمی چھین لی گئی تو اس کو اپنی قلبِ ماہیت کا صدمہ ہوا۔

(نحوی اعتبار سے كَأَنَّ کا اسم ما (موصولہ) بالماء مؤخر ہے، اور بالنار خبر مقدم ہے من بلل / من ضرم بیانیہ ہے۔)

شارح باجوریؒ نے قدماء کی عادت کے مطابق یہ طے کرلیا ہے کہ ہر لفظ بہت ناپ تول کر اور تمام معنوی خصائص اور شرعی رعایتوں کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ شاعر نے پانی کی صفت بلل (تری) لکھا اور 'برد' (ٹھنڈک) نہیں لکھا کیونکہ تری یا تر ہونا بھیگنا آگ کو اس کی حقیقت سے نکالتا ہے۔ بخلاف برد کے جو آگ باقی رہتے ہوئے بھی ممکن ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے "يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا" (اے آگ! ٹھنڈک اور سلامتی بن جا۔) اسی طرح پانی کو اس کی خاصیت آبی سے نکالنے والی شئے اضطرام (بھڑکنا) ہے، حرارت نہیں ہے، پانی جو گرم ہوجاتا ہے اس کو مَاءٌ حَارٌّ بولتے ہیں، ماء مضطرم نہیں کہتے، کیونکہ اس کا مطلب ہوتا کہ پانی شعلہ بن گیا۔ اسی طرح قدماء کا ایک طریقہ تفہیم یہ بھی ہے کہ خود ایک اعتراض قائم کرتے ہیں اور اس کا جواب دیتے ہیں تاکہ اگر کسی کے ذہن میں اس طرح کی بات آئے تو اس کو جواب مل جائے، اگر بغیر اعتراض نقل کیے ہوئے جواب دے دیا جائے تو اس کے لیے دفع دخل کہتے ہیں چنانچہ اوپر بلل اور ضرم کے ضمن میں جو کہا گیا وہ "دفع دخل" تھا۔ اب ایک اعتراض سنیے:

پانی اور آگ تو جمادات کی قسم میں ہیں، ان کو غم یا خوشی ہونا کیا معنی، یا قانون تکوینی کے پابند ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ (ہر شئے اللہ کے حمد کی تسبیح پڑھتی ہے۔) اور موقع تو یہ تھا کہ پانی اور آگ کو خوشی ہوتی نہ کہ غم۔

جواب: آگ اسلیے غمگین ہے کہ اس کے مزاج کی آتشیت سے اس کو محروم کردیا گیا اور پانی اس لیے رنجیدہ ہے کہ اس کی صفتِ آبی جاتی رہی، اور رنج وغم سے مراد ان کی ماہیت کا تبدیل ہوجانا ہے، جو غم کے مشابہ ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ 'آگ کے غم' سے مراد آگ والوں مجوسیوں

کا غم ہے، پانی کے رنج سے مقصود دریا پرست قوم کا رنج ہے۔

یہ شرح اس لیے نقل کر دی گئی کہ ہمارے قدیم بزرگوں کا انداز شرح معلوم ہو، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دور از کار باتیں ایسی ہیں جو خود شاعر حضرت بوصیریؒ کے ذہن میں نہ ہوں گی۔

وَالْجِنُّ تَهْتِفُ وَالْأَنْوَارُ سَاطِعَةٌ وَالْحَقُّ يَظْهَرُ مِنْ مَعْنًى وَمِنْ كَلِمِ

(ولادت باسعادت کی خوشی میں) اور جن آواز دینے لگے، روشنیاں کھل کر سامنے آگئیں، حق لفظ و معنی سے آشکار ہو گیا۔)

قرآن کریم سے جن کا ایمان لانا، قرآن سننا، اور اس کی تعلیمات کو اپنے ساتھیوں میں بیان کرنا ثابت ہے:

"قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا۔"

(اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دو کہ میرے پاس وحی آئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے اس کتاب کو سنا تو کہنے لگے ہم نے ایک عجیب قرآن سنا۔)

اور چند آیات کے بعد اسی سورت میں ہے:

"وَأَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدَىٰ آمَنَّا بِهِ"

(اور ہم نے جب ہدایت کی کتاب سُنی اس پر ایمان لے آئے)

لہٰذا کائنات کی مسرت عام کے موقع پر اگر وہ بھی فرحاں و شاداں ہوں اور ان کی مسرت سے آواز گونج رہی ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ اور ہر طرف نور ہی نور کا عالم ہونا، اور لفظ و معنیٰ سے صداقت آشکار ہونا، نفاق و کذب کا تاراج ہونا، یہ سب اگرچہ شاعرانہ تخیل ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پر جن کی نظر ہے، اور اس سیرت کے اثرات جو دنیا پر مرتب ہوئے ان کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں صداقت کا نور جتنی قوت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد چمکا اس سے پہلے کبھی نہیں ظاہر ہوا تھا۔

عَمُوا وَصَمُّوا فَاعِلَانُ الْبُشَائِرِ لَمْ تُسْمَعْ وَبَارِقَةُ الْإِنْذَارِ لَمْ تُشَمِ
مِنْ بَعْدِ مَا أَخْبَرَ الْأَقْوَامَ كَاهِنُهُمْ بِأَنَّ دِينَهُمُ الْمَعْوَجَّ لَمْ يَقُمِ

(دشمنانِ دین) اندھے اور بہرے ہو گئے اس لیے خوش خبریاں نہیں سنی گئیں اور انجام سے آگاہ کرنے والی بجلی کی چمک نظر نہیں آئی ــ اور جب کہ لوگوں کو ان کے کاہنوں (آئندہ کی خبر دینے والوں) نے بتا دیا تھا کہ ان کا غلط مذہب اب قائم نہ رہ سکے گا۔)

ان دونوں اشعار میں "دفع دخل" ہے، کہ جب یہ کہا جا رہا ہے کہ ولادت باسعادت سے سارا عالم روشن ہو گیا تو پھر کفارِ مکہ نے کیوں اس روشنی سے فائدہ نہیں اٹھایا، اور کفر و گمراہی پر کیوں لوگ مُصر رہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ روشنی تو بے شک موجود تھی مگر دشمنانِ دین کی نگاہوں کو قلب کی غلطیوں نے اندھا کر دیا تھا کہ وہ دیکھ نہیں سکتے تھے، اور بشارتوں کے اعلان سننے کی ان میں طاقت نہ تھی۔

لم تشم کا مادہ شام یشیم شیما، جس کے معنی ہیں بجلی کی چمک دیکھنا، اس شعر میں لف و نشر معکوس ہے، عَمُوا (اندھے ہو گئے) اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آگاہی دینے والی بجلی نہ دیکھ سکے، اور صَمُّوا (بہرے ہو گئے) کا نتیجہ یہ ہے کہ اعلان بشارت نہ سُن سکے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے پہلے آپؐ کی بعثت کی خبر ان کی آسمانی کتابوں میں موجود تھی اور ان کے علمائے دین اور کاہنوں (جو آئندہ کی خبریں دیا کرتے تھے) نے بتا دیا تھا کہ نور محمدی اس دنیا میں ظاہر ہو چکا ہے، اب باطل ادیان کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہ گیا ہے، مگر ان ظالموں نے ان سب کو فراموش کر دیا۔[1]

وَبَعْدَ مَا عَايَنُوا فِي الْأُفْقِ مِنْ شُهُبٍ مُنْقَضَّةٍ وَفْقَ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ صَنَمِ
حَتَّىٰ غَدَا عَنْ طَرِيقِ الْوَحْيِ مُنْهَزِمٌ مِنَ الشَّيَاطِينِ يَقْفُو إِثْرَ مُنْهَزِمِ

گزشتہ شعر من بعد ما عاینوا... الخ سے لفظاً و معنیً یہ اشعار مربوط ہیں۔

---

[1] آنحضرتؐ کی بعثت کی خبر پچھلی آسمانی کتابوں میں موجود ہے جس کو متعصب راہبوں نے مسخ کر دیا ہے اور وہ حصے حذف کر دیے ہیں جس میں قرآنی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے آگاہ کیا گیا تھا۔ "انجیل برنابا" کا مقدمہ جو اس کے عربی ترجمہ پر سید رشید رضا نے لکھا ہے اس میں تفصیل موجود ہے۔

ترجمہ: (اس کے بعد بھی وہ اپنے کفر پر قائم رہے جب کہ انھوں نے افق پر تاروں کا ٹوٹ ٹوٹ کر گرنا دیکھ لیا، اور جس طرح اصنام ارضی ٹوٹ گرے اسی طرح اجسام سماوی بھی ریزہ ریزہ ہو گئے ــــ اور وہ راستہ جو وحی کے آنے کا ہے اس راہ سے ایک شکست خوردہ دوسرے شکست خوردہ شیطانوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔)

ان دونوں شعروں میں قرآن کریم کی آیات کریمہ کی طرف اشارہ ہے شیاطین جو آگ سے بنے ہیں اور ان کو ہوا میں اڑنے اور پلکوں میں لاکھوں میل کی مسافت طے کرنے کی صلاحیت بخشی گئی ہے وہ سماء دنیا تک پہنچ جایا کرتے تھے اور فرشتوں کے درمیان ہونے والے چرچے سنا کرتے اور اہلِ زمین کو رنگ آمیزیوں کے ساتھ بتایا کرتے ہیں۔

چھپ کر بات سننے کو 'استراق السمع' کہتے ہیں۔ یہ اس طرح کی بات ہے جس کے لیے آجکل مشینی دور میں EAVESDROPPING کی اصطلاح ہے، یعنی چھپ کر کسی کی بات براہ راست یا بذریعہ مشینوں کے سننا، شیاطین (جنّوں) کا معمول تھا کہ وہ آسمانی خبریں سُن کر عوام میں غلط سلط بڑھا کر پھیلایا کرتے ان کو اس رات اس کام سے روک دیا گیا اور جو بھی اس کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا گیا اس کو ایک شعلہ کے ذریعہ جلا کر خاک کر دیا گیا۔

ایک روایت یہ بھی الباجوری نے نقل کی ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تو تین اوپر کے آسمانوں سے ان کو نکال دیا گیا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی تو کُل آسمانوں سے ان کو باہر کر دیا گیا۔

دوسرے شعر میں جو لفظ ہے عن طریق الوحی کہ وہ اس راستے سے ہٹا دیے گئے جس سے وحی آیا کرتی تھی، 'حتی غدا' کے معنی ہیں 'حتی اُصبح' اس کی خبر یقفو ہے، یعنی ایک کا دوسرے کے پیچھے لگ جانا، (غدا منهزم يقفو)۔

كَأَنَّهُمْ هَرَبًا أَبْطَالُ أَبْرَهَةٍ أَوْ عَسْكَرٌ بِالْحَصٰى مِنْ رَاحَتِيهِ رُمِي
نَبْذًا بِهِ، بَعْدَ تَسْبِيحٍ بِبَطْنِهِمَا نَبْذَ الْمُسَبِّحِ مِنْ أَحْشَاءِ مُلْتَقِمِ

[عربی داں حضرات کے لیے ضروری اشارات: کَأَنَّ کا اسم ضمیر هُمْ (شیاطین)، خبر ابطال ابرهة۔ هربا حال، عسکر معطوف علی ابطال۔ حصٰی جمع حصاة کنکریاں، راحة ہتھیلی، ضمیر راجع: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ رُمِیَ مجہول ماضی، ابرهة غیر منصرف ہے مگر ضرورت شعری کی وجہ سے منصرف کر دیا گیا۔ مسبح سے مراد حضرت یونس علیہ السلام، ملتقم جس نے حلق سے نیچے اتار لیا ہو]

ترجمہ: وہ نہ ماننے والے اس طرح بھاگے جیسے ابرہہ کی فوج کے بہادر سپاہی پر جب کنکریوں کی مار پڑتی تھی اس وقت بھاگے تھے یا اس فوج کی طرح تتر بتر ہو گئے جن پر غزوۂ بدر کے موقع پر (حسب روایت بخاری) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں ماری تھیں، اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں بچا جس کی آنکھ میں خاک نہ پڑی ہو۔ گویا وہ لوگ دستِ رسول پاکؐ کے اندر تسبیح پڑھنے والے کنکروں سے نابینا کر دیے گئے جس طرح حضرت یونسؑ نگل لینے والی (مچھلی) کے جوف سے نکال دیے گئے تھے، جب کہ اس نے ان کو نگل لیا تھا۔)

ان دو شعروں کا تعلق اوپر کے دو شعروں سے ہے کہ آنحضرتؐ کی دعوت حق سے روگردانی کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے نبوت کی نشانیاں دیکھیں مگر شیطانوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے اور ایسے بھاگے جیسے ابرہہ کی فوج کے سورما اور رسول اللہ کے گھیراؤ کرنے والے کفار بھاگے تھے اور وہ کنکر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے جس طرح نکلے تھے یا جس طرح حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ سے نکلے تھے۔

جَاءَتْ لِدَعْوَتِهِ الْأَشْجَارُ سَاجِدَةً تَمْشِي إِلَيْهِ عَلٰى سَاقٍ بِلَا قَدَمِ
كَأَنَّمَا سَطَرَتْ سَطْرًا لِمَا كَتَبَتْ فُرُوعُهَا مِنْ بَدِيعِ الْخَطِّ بِاللَّقَمِ

(آپؐ کے معجزات کے بیان میں یہ واقعات بھی ہیں:

(آپؐ کے بلانے پر درخت بغیر اپنی جڑوں کے صرف تنوں پر سر جھکائے چلے آئے، گویا کہ ان درختوں نے راستے کے بیچ ایک سطر کھینچ دی جس کو ان شاخوں نے نایاب رسم الخط میں لکھ دیا تھا۔)

ان دونوں شعروں میں ایک معجزہ کا ذکر ہے، جس کی ایک روایت مستند ہے۔ امام مسلمؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ آپ حاجت بشری کے لیے جا رہے تھے [مگر کوئی آڑ

کسی درخت یا ٹیلہ کا نہ تھا ــــ اور عادت شریفہ یہ تھی کہ جب آپ اس قصد سے نکلتے تو جتنی دور لوگ عام طور سے جایا کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ دور نکل جاتے کہ لوگوں کی نگاہ وہاں تک نہ پہونچتی اور کسی پہاڑ کے کھوہ یا درختوں کے جھنڈ میں اپنے آپ کو پوشیدہ کرلیتے، مگر اس مرتبہ سامنے کوئی جھاڑی نہ تھی، درخت تھے مگر متفرق اکّا دکّا، جو پردہ کا کام نہیں دے سکتے تھے] اس موقع پر ایک معجزہ کا ظہور ہوا جس کو سبھوں نے دیکھا کہ آپؐ نے ایک درخت کی شاخ ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچی وہ پورا درخت آپؐ کے ساتھ کھنچتا ہوا اس طرح آیا جیسے کسی جانور کے کان پکڑ کر کوئی لے آئے۔ آپؐ نے اسی طرح دوسرے درخت کی شاخ پکڑلی اور وہ ساتھ ہولیا۔ ان دونوں کو آپؐ بیچ میدان میں لے آئے اور ان دونوں درختوں نے ایک دیوار سی بنادی[1]، اس کو شاعر حضرت بوصیریؒ تشبیہ دیتے ہیں کہ گویا صفحۂ قرطاس پر ایک لکیر کھینچ دی۔

لقم وسط راہ کو کہتے ہیں، اور سجدہ کرنے کا مفہوم لغوی معنوں میں ہے کہ جھک کر مطیع و فرمانبردار ہوکر۔ اور اگر زمین بوس ہونے کا مفہوم ہو تو "مقصد پردہ پوشی" حاصل نہ ہوگا۔

ایک روایت شیخ باجوریؒ نے اپنی شرح میں نقل کی ہے مگر بزرگانِ سلف عام طور پر احادیث کی تخریج اور اس کی سند کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ "سفر السعادۃ" مطبوعہ حلبی مصر ۱۳۰۴ھ میں یہ روایت موجود ہے۔ قاضی عیاض نے الشفاء میں بھی اس کو نقل کیا ہے۔ بہرحال ان حوالوں سے یہ روایت نقل کرتا ہوں۔

ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اپنا کوئی معجزہ (آیۃ) دکھایئے، جس سے یہ سمجھوں کہ آپؐ اللہ کے فرستادہ سچے نبی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، تم سامنے درختوں میں سے کسی درخت سے کہو تم کو رسول اللہؐ بلاتے ہیں۔ چنانچہ وہ گیا اور ایک درخت سے مخاطب ہوکر کہا، تم کو رسول اللہ بلاتے ہیں، وہ درخت دائیں جانب مائل ہوا، پھر بائیں رُخ مڑا، آگے کی طرف جُھکا اور پشت کی جانب خمیدہ ہوا اور اس کی جڑیں زمین سے جدا ہوگئیں اور وہ پورا رینگتا ہوا اس بدوی کے

---

[1] یہ روایت صحیح مسلم باب الزہد میں ہے، اسی حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ بعد میں یہ دونوں درخت اپنی اپنی جگہ پر از خود واپس گئے۔

ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور یہ آواز بلند ہوئی السلام علیک یا رسول اللّٰہ !۔ اعرابی (بدو) نے عرض کیا اب آپ اس کو واپس جانے کا حکم دیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اشارہ سے واپس ہونے کا حکم دیا اور وہ درخت اسی طرح رینگتا ہوا اپنی جگہ پر جاکر جم گیا۔

مِثْلُ الْغَمَامَةِ أَنّٰى سَارَ سَائِرَةٌ تَقِيْهِ حَرَّ وَطِيْسٍ لِلْهَجِيْرِ حَمِيْ

(جس طرح ابر کا ٹکڑا جہاں آپ جاتے وہ سایہ فگن رہتا، آپؐ کو دوپہر کی سخت تپش کی گرمی سے محفوظ رکھتا۔)

(عربی داں حضرات کے لیے: لفظ "مثل" ماقبل "الأشجار" کا حال منصوب بھی ہوسکتا ہے اور سائرۃ اس کی صفت، اور تقی الخ حال، وطیس دراصل تنور کو کہتے ہیں، سورج یا جنگ کے لیے استعارہ تصریحیہ ہے۔ ھجیرۃ اشتداد حرارۃ کا وقت حَمِی ماضی گرم ہوا بمعنی حام فاعل للھجیر)

پہلے دو شعروں میں ایسے معجزے کا ذکر تھا جس کا تعلق زمین سے تھا۔ اس شعر میں ایسے معجزہ کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق اوپر آسمان سے ہے۔ بادل کا ٹکڑا آپؐ کے لیے سایہ فگن رہا ہے۔ اس کا واقعہ تمام احادیث و سیر کی کتابوں میں موجود ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عم بزرگوار ابوطالب اور دوسرے بزرگان قریش کے ہمراہ ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام گئے تو بحیرہ کے راہب نے جو کبھی اپنی خلوت سے باہر نہیں نکلتا تھا، اس قافلہ کے استقبال کے لیے باہر نکل آیا اور قافلہ کے افراد پر غائر نظر ڈالی اور ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر پہچان لیا، اور رفقائے سفر سے کہا کہ ان کا خیال رکھنا یہ سید العالمین ہیں جن کو اللہ تعالیٰ سارے عالم کے لیے رحمت بناکر مبعوث فرمانے والا ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کو یہ کس طرح معلوم ہوا؟ راہب نے کہا کہ میں نے جو علامتیں آنے والے نبی کی پڑھی ہیں ان میں سے تمام علامتیں اِنؐ میں پائی جاتی ہیں۔ آپؐ کے سر پر بادل کا ٹکڑا سایہ فگن ہے اور ان کی پُشت پر مہر نبوت ہے، راہب کی فرمائش پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پُشت مبارک دکھائی، راہب نے اس کو چوما، آنکھوں سے لگایا اور کہا یہی وہ ناموس ہے جس کی بشارت دی گئی۔ (اس روایت کے الفاظ میں کمی بیشی ہے، خلاصۂ کلام ایک ہی ہے'

سفر السعادۃ میں بہت تفصیل ہے، سیرۃ ابن ہشام میں الفاظ مختصر ہیں۔)

أَقْسَمْتُ بِالْقَمَرِ الْمُنْشَقِّ إِنَّ لَهُ مِنْ قَلْبِهِ نِسْبَةً، مَبْرُوْرَةُ الْقَسَمِ

(میں قسم کھاتا ہوں چاند کے پیدا کرنے والے کی اس بات پر کہ آپؐ کا قلب مبارک اس چاند کے مشابہ ہے جو بطور معجزہ شق کیا گیا تھا۔ اور میری یہ قسم سچی قسم ہے۔)

شارح قصیدہ شیخ ابراہیم باجوری نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ اَقْسَمْتُ بِالْقَمَرِ سے مراد اَقْسَمْتُ بِرَبِّ الْقَمَرِ ہے، یعنی چاند کی قسم نہیں بلکہ چاند کے رب کی قسم۔ (جار مجرور کے درمیان اضافت محذوف ہے) کیونکہ بندوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی قسم کھائیں البتہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جس کی چاہے قسم کھائے، اس لیے جو بات قرآن کریم میں روا ہے، والشمس وضحاها، والسماء والطارق... الخ یہ سب قسمیں حق تعالیٰ جل شانہٗ کی جانب سے ہیں، مگر بندوں کو اس کی اجازت نہیں ہے، قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو چاند سے مشابہت ہے، چاند بھی آپؐ کی انگلیوں کے اشارے سے شق ہوا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک بھی شق کیا۔ شق القمر کا معجزہ تمام صحاح سے تو ثابت ہی ہے، قرآن کریم میں بھی مذکور ہے۔

واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ کفار قریش نے آپؐ سے اظہار معجزہ کی درخواست کی، آپؐ نے اپنی انگشت مبارک سے اشارہ فرمایا اور چاند کے صاف دو ٹکڑے ہو گئے، اس کا ایک ٹکڑا ایک پہاڑ پر گرا اور دوسرا اس کے نیچے، کفار نے اس معجزہ کو تسلیم کرنے کے بجائے اس کو سحر بتایا اور سَحَرَنا محمدٌ یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں سحر کر دیا یعنی آنکھوں کو نظر بند کر دیا، لہٰذا دوسرے شہروں میں جا کر لوگوں سے پوچھنا چاہیے کہ آیا انھوں نے بھی چاند کے ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا تھا، چنانچہ لوگوں میں اس کا چرچا ہوا اور دور دراز سے آنے والوں سے اور وہاں جا کر دریافت کیا گیا، ہر ایک نے اس کی تصدیق کی، اس پر کفار نے کہا یہ سحر مستمر (ہمیشہ کا جادو) ہے۔

سورۂ قمر کی ابتدائی آیات میں ان کا ذکر ہے:

"اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ وَاِنْ يَّرَوْا آيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۔"

(قیامت قریب آپہونچی اور چاند شق ہو گیا، اور (اگر) کافر کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منھ پھیر لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ ایک ہمیشہ کا جادو ہے۔)

(ترجمہ: مولانا فتح محمد خاں جالندھری)

حضرت بوصیریؒ اپنے اس شعر میں کہتے ہیں کہ اس شق ہو جانے والے چاند سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو نسبت۔ یعنی مشابہت ہے کیونکہ آپؐ کا صدر مبارک بھی شق کیا گیا ہے، اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار نہیں بلکہ چار مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا۔ ایک شاعر نے اس کو نظم بھی کیا ہے:

وَشُقَّ صَدْرُ الْمُصْطَفٰى وَهُوَ فِيْ دَارِ بَنِيْ سَعْدٍ بِلَا مِرْيَهْ
كَشَقِّهٖ وَهُوَ ابْنُ عَشْرٍ. وَفِيْ لَيْلَةِ مِعْرَاجٍ، وَفِي الْبِعْثَهْ

(حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک (پہلی بار) اس وقت شق کیا گیا جبکہ آپ بنو سعد (حضرت حلیمہ سعدیہ کے قبیلہ) میں تھے جس میں کوئی شک ہی نہیں ہے، جس طرح اس کو (سینۂ مبارک) اس وقت شق کیا گیا جب آپؐ کی عمر دس سال تھی، پھر شب معراج میں یہی عمل پیش آیا اور بعثت کے وقت آپ کا سینۂ مبارک چاک کیا گیا تھا۔)

الباجوریؒ لکھتے ہیں کہ ایک روایت پانچویں مرتبہ شق صدر کی ہے جو اس وقت پیش آیا تھا جب کہ آپؐ کی عمر شریف بیس ۲۰ سال کی تھی، مگر یہ روایت ثابت نہیں ہے، شاعر نے اس مضمون کو (کہ قلب مبارک بھی جو شق القمر کے مشابہ ہے) زور دے کر بیان کیا ہے کہ میری قسم وہ ہے جس کو مبرور بالکل سچ کہا جائے۔

وَمَا حَوَى الْغَارُ مِنْ خَيْرٍ وَمِنْ كَرَمٍ وَمَنْ كُلِّ طَرْفٍ مِنَ الْكُفَّارِ عَمِي

(اور غار ثور نے جس خیر و کرم کو اپنی آغوش میں لیا اور وہ جس سے تمام کفار کی نگاہیں کور ہو گئیں۔)

اس شعر میں اس معجزہ کا ذکر ہے کہ جب ہجرت کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیق غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چلے ہیں تو مکہ کے قریب کے پہاڑ کی کھوہ (غار) میں پناہ لی ہے اور کفار قریش نے آپؐ کا تعاقب کیا اور اس غار تک پہونچ گئے تھے جس کے اندر آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ موجود تھے مگر وہ آپ کو دیکھ نہ سکے، حالانکہ روایات میں ہے کہ اگر وہ لوگ اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تو آپؐ کو پا لیتے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی نگاہوں کو بے نور کر دیا۔

اس شعر میں خیر۔ کرم کے دو لفظ آئے ہیں، خیر کا لفظ بہت عام ہے مگر اس کے معانی بہت وسیع ہیں، اللہ کی ہر نعمت کو خیر کہتے ہیں، ہر خوبی کو خیر کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے، اور کرم کا لفظ عربی محاورے میں سخاوت کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس شعر میں "خیر" سے مراد خوبی ذاتی و صفاتی کے جامع، بلکہ شہر خوبی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس مراد ہے، اور "کرم" سے اشارہ حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف ہے جنھوں نے اپنا سارا اندوختہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر لاکر ڈال دیا تھا۔ (طَرْف) کے معنی نگاہ کے ہیں۔

فَالصِّدْقُ فِي الْغَارِ وَالصِّدِّيْقُ لَمْ يَرِمَا وَهُمْ يَقُوْلُوْنَ: مَا بِالْغَارِ مِنْ اِرَمِ

الصدق سے مراد ذوالصدق یعنی سراپا صداقت، مراد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، اور الصدیق سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا لقب ہے، (یہ لقب حضرت ابوبکرؓ کو اس وقت عطا ہوا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسراء و معراج کا واقعہ ذکر کیا تو کفار نے تضحیک کے انداز میں اس کی تردید کی اور سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ (ص) یہ بات کہتے ہیں تو بالکل سچ ہے، کیونکہ ہم اس سے زیادہ نادر انوکھی بات پر ایمان لا چکے ہیں کہ آپؐ پر وحی آسمان سے آتی ہے اور جبرئیلؑ خدمت عالی میں حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ کا پیغام لاتے ہیں) بہر حال اس شعر کا ترجمہ یہ ہے:

(سراپا صداقتؐ اور صدیقِ امتؓ غار سے جدا نہیں ہوئے، یعنی اسی میں موجود رہے اور کفار کہتے رہ گئے کہ غار میں کچھ نہیں رکھا ہے۔)

لفظ 'یرما' کی اصل یریمان ہے رام یریم ریمًا جدا ہونا، ٹلنا، جگہ چھوڑنا، نون تثنیہ تو لَمْ نافیہ کی وجہ سے حذف ہوا، اور یریما کی 'ی' ضرورت شعری کی وجہ سے، اِرَم پہاڑ کے دہانے پر بطور علامت کے رکھے ہوئے پتھر کو بھی کہتے ہیں اور حاجت و ضرورت، معمولی حقیر چیز۔

ظَنُّوا الْحَمَامَ وَظَنُّوا الْعَنْكَبُوْتَ عَلٰى خَيْرِ الْبَرِيَّةِ لَمْ تَنْسِجْ وَلَمْ تَحُمِ

(کفار کو گمان ہوا خیر البریہ صلی اللہ علیہ وسلم پر (یعنی جس غار میں آپؐ تھے اس کے دہانے پر) کبوتری ہے یا مکڑی نے جالا تن دیا ہے حالانکہ نہ تو کبوتری تھی اور نہ

مکڑی کا جالا۔)

قاعدہ یہ ہے کہ انسان کو دیکھتے ہی کبوتر اڑ جاتے ہیں، اور جب کوئی کمزور سے کمزور آدمی بھی ایسی جگہ داخل ہوگا جہاں مکڑی کا جالا ہے تو وہ ٹوٹ جائے گا، لہٰذا کہیں پر کبوتر کو اڑتا چگتا لگاتا دیکھا جائے یا مکڑی کا جالا دیکھا جائے تو بھی یقین آتا کہ یہاں کوئی نہیں ہے، مگر اللہ تعالیٰ کا یہ انتظام تھا کہ کفار کو ایسا ہی نظر آیا۔

(عربی داں حضرات کے لیے: لم تنسج / لم تحم متعلق بخیر البریۃ لف ونشر مشوش (غیر مرتب) الحمام۔ لم تحم۔ العنکبوت: لم تنسج۔ لم تنسج سے پہلے واؤ حالیہ محذوف مانا جائے گا۔)

وِقَايَةُ اللّٰهِ اَغْنَتْ عَنْ مُضَاعَفَةٍ مِنَ الدُّرُوْعِ، وَعَنْ عَالٍ مِنَ الْاُطُمِ

(اللہ کی حفاظت نے دوہری زرہ پہننے (یا زرہ کے آہنی کڑوں کو دوہرا کرنے) سے بے نیاز رکھا، اور اس بات سے بے نیاز رکھا کہ بلند پہاڑیوں کی چوٹیوں پر جا کر پناہ لیں۔)

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت ہر حال میں شریک تھی، اور آپؐ کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے براہ راست اپنے ہاتھوں میں رکھی تھی، اس لیے آپؐ کو اپنی ذات کے لیے حفاظتی تدبیر میں اہتمام و غلو کی ضرورت نہ تھی، نہ تو اس کی ضرورت تھی کہ دوہری زرہ پہنیں، یا آہنی خود لگائیں، یا زرہ کی کڑیوں کو دوہرا کریں، بلکہ معمولی ساظاہری انتظام فرمالیا کرتے تھے جو بشریت کا تقاضا تھا۔

یہ شعر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ 'حفاظت' دراصل اللہ ہی کی حفاظت ہے، ورنہ ظاہری تدبیریں جس قدر بھی کی جائیں سب بیکار ثابت ہوتی ہیں، ابھی گنتی کے چند برسوں میں دیکھیے کہ کتنے ملکوں کے سربراہوں کو قتل کیا گیا، جب کہ ان کی حفاظت پر لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں کے حساب سے دولت صرف کی جاتی رہی ہے مہینوں سے انٹیلیجنس ایک ایک سڑک اور ایک ایک موڑ کا جائزہ لیتے رہتے ہیں جہاں سے کوئی سربراہ حکومت گزرنے والا ہوتا ہے، فضا سے ہیلی کاپٹر پہرہ دیتے رہتے ہیں، ہر ہر عمارت کا جائزہ لیا جاتا ہے جو اس راستے کے قریب واقع ہے جہاں سے "موکب ہمایوں"

گزرنے والا ہے، ملک کی وزارت داخلہ تو چوکنا رہتی ہے، بیرونی ممالک کے ماہرین سے حفاظتی تدابیر میں مدد لی جاتی ہے۔ پھر بھی کیا ترقی یافتہ اور کیا غیر ترقی یافتہ دونوں قسم کے ممالک میں برسر اقتدار بلکہ کہنا چاہیے سفید سیاہ کے مالک اشخاص قتل کیے جاتے ہیں۔ مثالیں جب چاہیے انگلیوں پر گن لیجیے، اس کے مقابلہ میں دیکھیے بلکہ ایسے دور میں جب سراغرسانی کا فن ایجاد نہیں ہوا تھا، حفاظتی دستے اور سراغرساں تو الگ رہے معمولی پہرہ دار کا بھی تصور نہیں، اور دشمن پورا قبیلہ، علاقہ اور شہر کا شہر، مگر خدائی نگہداشت اور حفاظت کا یہ عالم کہ دشمنوں کے بیچ سے ایسا نکالتا ہے جیسے گندھے ہوئے آٹے سے کوئی بال نکال لے، جس بات کو سمجھنے سے عقل عاجز رہے اسی کو معجزہ کہتے ہیں۔

وَمَا سَامَنِي الدَّهْرُ ضَيْمًا وَاسْتَجَرْتُ بِهٖ ۔۔۔ إِلَّا وَنِلْتُ جِوَارًا مِنْهُ لَمْ يَضِمِ
وَلَا الْتَمَسْتُ غِنَى الدَّارَيْنِ مِنْ يَدِهٖ ۔۔۔ إِلَّا اسْتَلَمْتُ النَّدٰى مِنْ خَيْرِ مُسْتَلَمِ

(جب بھی زمانہ نے مجھ پر ستم ڈھایا اور میں نے ان کی پناہ طلب کی تو مجھے ان سے ایسی پناہ ملی جو معمولی نہیں ہے۔ اور میں نے جب بھی دونوں جہان کی بہبود ان کے ہاتھ سے چاہی تو جود وسخا میں نے پالیا ایسی جگہ سے پایا جس سے بہتر جگہ کوئی نہیں ہو سکتی۔)

دوسرے نسخوں کے بموجب جس میں پہلے شعر کے الفاظ مختلف ہیں، اس کا ترجمہ یوں ہوگا:

(جب کسی دن بھی زمانہ نے مجھ پر ستم ڈھایا اور میں نے ان کی پناہ .... الخ)

ان دو شعروں کا مفہوم واضح ہے، خلاصہ یہ ہے کہ زمانہ (مراد اہل زمانہ) کے ستم یعنی مصائب کی کٹھن گھڑیوں میں جب میں نے ان کو پکارا میری مراد پوری ہوئی اور ان سے سہارا مل گیا۔

جِوَار عربی میں پڑوس کو کہتے ہیں۔ جار کے معنی پڑوسی کے ہیں۔ استجار کے معنی ہیں پڑوس طلب کرنا۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ حفاظت، ذمہ داری، نگہداری اور دشمنوں کے حملے کے وقت مدافعت کی ذمہ داری۔ عرب ماحول یہ تھا کہ ایک ایک گھر دور فاصلہ پر ہوتا، اور ہر شخص آپ اپنی حفاظت میں رہتا، مگر دشمنوں سے خوف کے وقت کسی قبیلہ کا سردار دوسرے لوگوں کو جو اس کے حلیف ہوتے یا اس کے ہمنوا ہوتے ان کو اپنے پڑوس میں بلا لیتا اور جب اس کے پڑوس میں آ جاتا تو اس کو کوئی آنکھ نہیں دکھا سکتا، کیونکہ جس کے جوار میں وہ آیا ہے وہ اس کا صرف ذمہ دار ہی نہیں

بلکہ اس کے پڑوس میں آئے ہوئے فرد یا خاندان پر حملہ عین سردار پر حملہ قرار دیا جاتا۔ اس پس منظر میں "پڑوس طلب کرنا، پڑوس میں آنا" کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کی ذمہ داری، حفاظت، اور ضرورت کے وقت ہر طرح کی کفالت کا حاصل ہو جانا۔

ان دونوں شعر میں ضمیر اُن، اس [استجرت بہ ۔۔۔ من یدہ] اللہ کی طرف راجع ہے اور قرینہ یہ ہے کہ اس سے پہلے شعر 'وقایۃ اللّٰہ الخ' میں اسم جلالہ (اللہ) صراحۃً مذکور ہے، اور موقع بھی اسی مضمون کا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غار ثور میں اور ہر خطرہ کے موقع پر حفاظت کی اور اس سے جب بھی مدد طلب کی جاتی ہے مل جاتی ہے لیکن چوں کہ قصیدہ نعت نبوی میں ہے اور موضوع کلام رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی ذات اقدس ہے اس لیے عام خیال یہی ہے کہ یہ ضمیریں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف راجع ہیں، اور شاعر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مصائب کی گھڑیوں میں یا دینی و دنیوی حاجت روائی کے لیے جب بھی آپؐ سے فریاد کی تو میری مراد پوری ہوگئی۔

یہ بات ایسی ہے جس کی وجہ سے امت اسلامیہ کے علماء و صالحین کا ایک بڑا گروہ جو عقیدۃً توحید میں پختہ ہے اور شرک کے معاملہ میں کسی ڈھیل یا لچک کو برداشت نہیں کرتا اور شرک کی اگر کہیں بُو بھی آئے تو اس سے پناہ مانگتا ہے وہ اس طرح کی براہ راست فریاد کو ناجائز سمجھتا ہے، بلکہ "ناجائز" کا لفظ بھی کمزور ہے وہ اس کو مشرکانہ بات سمجھتا ہے کہ حضور اقدس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس عقیدۂ شرک کی بیخ کنی کے لیے مبعوث ہوئے اور جس کے خلاف زندگی بھر آپؐ نے جہاد کیا وہی بات کہی جائے اور آپؐ ہی کی ذات گرامی کو اس کا ہدف بنایا جائے، اس سے زیادہ آپؐ کی شان میں بے ادبی کیا ہو سکتی ہے کہ یہ بظاہر احترام و عقیدت کا اظہار ہے مگر درپردہ انتہائی بے باکی، بدزبانی اور بے ادبی ہے۔

ایک طرف تو یہ حقیقت ہے جس کی وضاحت کی گئی، دوسری طرف یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اس قصیدہ کے ناظم شیخ بوصیریؒ ایک مقتدر عالم دین، اور پابند سنت بزرگ تھے، انھوں نے اس قصیدہ میں چند شعر پہلے، یہ بات کہی ہے۔

دَعْ مَا ادَّعَتْهُ النَّصَارٰى فِي نَبِيِّهِمْ ۔۔۔ وَاحْكُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِيْهِ وَاحْتَكِمِ

یعنی نصاریٰ (عیسائیوں) نے اپنے نبی کے بارے میں جو دعویٰ کیا، اس روش کو تم

نہ اختیار کرو، اس کے علاوہ (صفات الوہیت کو چھوڑ کر، اعتدال پر قائم رہتے ہوئے جو مدح بھی اپنے رسول کریمؐ کی کرنا چاہو، کرو۔

صفات الوہیت یعنی جو صفت صرف اللہ ہی کی ہو سکتی ہے اس میں کسی کی فریاد سننا، نفع اور ضرر پہنچانا داخل ہے، لہٰذا حضرت بوصیریؒ نے یہ بات کہی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد کی تو آپؐ نے سُن لی، پناہ مانگی تو پناہ دے دی، دنیا کی بہبود طلب کی تو آپؐ نے عطا فرما دی، آخرت کی نجات اور بخشش مانگی تو وہ مل گئی" اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ دین و دنیا کی بھلائیاں آپ ہی کی لائی تعلیمات سے ملتی ہیں، اور مصائب سے نجات آپ ہی کے بتائے ہوئے راستے یعنی اللہ تعالیٰ سے دعا و استغفار کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ دو شعر کسی اور نے اضافہ کر دیا ہو، کیونکہ اس سے پہلے کے شعر اور بعد کے اشعار میں ربط نہیں ہے۔ پہلے اشعار میں معجزات کا بیان ہے اور یہ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو کن خصائص سے نوازا ہے، اور بعد کے شعروں میں بھی آپؐ کے خصائص نبوت کا ذکر ہے، بہر حال ایک عالم حُبِّ نبوی سے سرشار، اور مقبولِ بارگاہ نبوی کے لیے جو ممکن تاویل ہو کرنا چاہیے تاکہ ان کے بارے میں بدگمانی نہ کی جائے۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مناظرانہ گفتگو میں جہاں حقائق سے بحث نہیں ہوتی بلکہ اپنے مقابل کی زباں بندی اور عوام کو مغالطہ میں ڈالنا مقصود ہوتا ہے وہاں یہ کہا جاتا ہے کہ مانگنا اور طلب کرنا، التماس و التجا کرنا، کسی کو نفع پہنچانے یا نقصان سے بچانے پر قادر سمجھنا شرک نہیں ہے، ہم آئے دن اپنے جیسے انسانوں سے حاجت روائی کی درخواست کرتے رہتے ہیں، بلکہ اپنے سے کمتر افراد سے کہتے ہیں کہ یہ لاؤ اور وہ دو۔ جب ایسا ہے تو پھر نبی رحمت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگنا اور طلب کرنا اور ان سے التجا و التماس کرنے پر اعتراض کیوں ہے؟ اور اگر یہ کوئی کہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی، وہ ہم میں موجود نہیں ہیں، تو کہا جائے گا تیرے منہ میں خاک۔ حضور اکرمؐ تو بڑی چیز ہیں ان کے غلام اور در غلام شہداء زندہ ہیں، قرآن نے کہا ہے، لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ الخ یعنی اللہ کی راہ میں قتل کیے جانے والوں کو مردہ نہ کہو۔

اس طریق استدلال میں مغالطہ یہ ہے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی خصوصیت ہے کہ اس کو بن دیکھے اس کو ہر جگہ حاضر و ناظر مانا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات، اس کے مظاہر ہر جگہ اور ہمہ وقت ہیں مگر خود

اس کی ذات کو دیکھنے کے لیے ہماری مادّی آنکھیں کافی نہیں ہیں، اس نے اپنے پیغمبروں کو بھی مخاطب کیا تو پس پردہ یا فرشتوں کے ذریعہ، (کرام بررۃ) اللہ کے علاوہ جن کے غیبی وجود پر ایمان ہے جیسے فرشتے، یا جن، تو ان کے وجود کو تسلیم کرنے کے باوجود کوئی یہ نہیں کہتا کہ اے جبرئیلؑ یہ کام کر دیجیے، یا فلاں نعمت بخش دیجیے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیائے کرام اللہ کے نزدیک رزق پاتے ہیں، ان کے پاک جسم کو مٹی نہیں کھاتی، وہ عند اللہ زندہ پائندہ رہیں گے یہ سب تسلیم مگر یہ واقعہ ہے کہ ہم ان کو دیکھتے نہیں، ان کی آواز نہیں سنتے، ان کو حسّی طور پر اپنی ان ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے (خواب میں دیکھ لیں یا کوئی بزرگ اپنے مکاشفہ سے دیکھ لیں یہ سب کے لیے حجت نہیں اور نہ ان پر شرعی احکام مرتب کیے جا سکتے ہیں) اس حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جیسے انسانوں پر قیاس کرنا بے ادبی ہے، ناواقفیت کی وجہ سے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صفات الوہیت کا جامع سمجھ کر وہ ان کی عزت و توقیر کر رہے ہیں اور ان سے محبت و تعلق کا اظہار کر رہے ہیں حالانکہ صورت حال برعکس ہے۔

لَا تُنْكِرِ الْوَحْيَ مِنْ رُؤْيَاهُ، اِنَّ لَهٗ قَلْبًا اِذَا نَامَتِ الْعَيْنَانِ لَمْ يَنَمِ

وحی کا انکار نہ کرو وہ وحی جس کی ابتدا رویائے صالحہ سے ہوئی تھی، (اور سمجھ لو) آپؐ کا قلب مبارک ہمیشہ بیدار رہتا تھا۔ اگرچہ آنکھیں نیند کی حالت میں ہوتی تھیں۔)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا رویائے صادقہ (سچے خواب) سے ہوئی اور آپؐ جب خواب استراحت میں ہوتے اس وقت بھی آنکھوں پر نیند آجاتی مگر قلب مبارک بیدار ہی رہا کرتا تھا، لہٰذا وحی کی جتنی قسمیں ہیں ان میں سے کسی پر شک کرنا جائز نہیں ہے۔

فَذَاكَ حِيْنَ بُلُوْغٍ مِنْ نُبُوَّتِهٖ فَلَيْسَ يُنْكَرُ فِيْهِ حَالُ مُحْتَلِمِ

(اور آپ پر وحی کے آنے کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب عمر شریف نبوت کی چالیس سال) ہو گئی جب کہ خواب میں دیکھے جانے ـــــ یا وحی کے آنے کا انکار نہیں ہو سکتا۔)

یعنی آپؐ پر وحی آنے کا سلسلہ چالیس سال کی عمر شریف جب ہو گئی شروع ہوا، اور جس عمر میں خواب دکھائی دینا قانون تکوینی کے مطابق صحیح ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ پر وحی نبوت سے پہلے نہیں آئی۔

تَبَارَكَ اللّٰهُ مَا وَحْيٌ بِمُكْتَسَبٍ وَلَا نَبِيٌّ عَلٰى غَيْبٍ بِمُتَّهَمٍ

(ساری عظمتیں اللہ کی ہیں! وحی کوشش و کمائی سے نہیں ملتی۔ اور کسی نبی پر غیب کے معاملہ میں اتہام نہیں لگایا جاسکتا۔)

مطلب یہ ہے کہ نبوت محض اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، جو نبی بنایا گیا وہ اس کی مشیت اور دین کی وجہ سے بنایا گیا۔ نبوت کا مقام قوتِ بازو سے، مجاہدہ اور ریاض سے، حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کریم میں وارد ہے:

اَللّٰهُ يَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔ (الانعام ۱۲۴)

(اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے کہ (رسالت کا کون سا محل ہے) وہ اپنی پیغمبری کس کو عنایت فرمائے۔)

جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ رسالت ذاتی کوششوں سے حاصل ہو سکتی ہے وہ کفر صریح کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وحی جو فرمان الٰہی ہے اور جس کے احکام تمام اہل ایمان پر واجب اور فرض ہیں وہ وحی کوشش اور کمائی سے نہیں ملتی، البتہ قلب پر کسی بات کا القاء کر دینا، یا وحی کے دوسرے معانی میں مثلاً اشارہ کرنا، کوئی خوش خبری خواب میں سنا دینا، یا کسی آنے والی مصیبت سے آگاہ کر دینا، لغت کی رو سے ان کو کبھی کبھی وحی کہہ دیتے ہیں۔ یا کسی نوعِ حیوان کو اس کے خلقی یا فطری فرائض کی طرف مائل کرنے کو بھی وحی کہا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (النحل ۶۸)

(اور تمہارے رب نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا۔)

غیر نبی کے دل میں بات ڈال دینے کو بھی 'وحی' کہا گیا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں بات ڈال دی گئی کہ ان کو دودھ پلائیں:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ (القصص ۷)

(اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ اس کو دودھ پلاؤ۔)

لیکن اس وحی فطرت یا الہام تکوینی میں — اور اس وحی میں جو انبیائے کرام کو بواسطۂ جبرئیل علیہ السلام یا بلا واسطہ خواب یا القاء کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے، بڑا فرق ہے۔ انبیائے کرام پر وحی اس لیے

آتی ہے کہ وہ انسانوں کو اللہ کے احکام، اللہ کی صفات، اور آخرت کے بارے میں بتائیں، اس وحی میں کوئی غیر نبی شریک نہیں ہوتا، اور یہ وحی انبیاء کے لیے خاص ہے۔

دوسرے مصرعہ میں یہ بتایا ہے کہ انبیائے کرام پر جو وحی آتی ہے اس کو وہ چھپاتے نہیں ہیں، کسی سے پوشیدہ نہیں رکھتے، اس کے بتانے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ (سورۂ تکویر ۲۵)

(وہ پوشیدہ باتوں کے ظاہر کرنے میں بخیل نہیں۔)

یعنی اللہ تعالیٰ نے انھیں جو کچھ بھیجا ہے وہ اس کو سب سے کہتے ہیں، اور سکھاتے اور سناتے ہیں۔ 'غیب' سے مراد وحی کے ذریعہ بتائی ہوئی باتیں جن کا علم سوائے نبی کے کسی کو نہیں ہوتا اور صرف اس کے بتانے ہی پر لوگوں کو معلوم ہوتا ہے، لہٰذا شیخ بوصیریؒ کہتے ہیں کہ نبوت نہ تو اکتسابی شئی ہے اور نہ کسی نبی کو وحی کے چھپانے کا الزام دیا جاسکتا ہے۔

شارحین قصیدہ نے یہاں ایک غیر متعلق بحث چھیڑ دی ہے کہ نبی تو خیر معصوم ہوتا ہے اور کوئی شخص اپنی کاوش سے نبی کا درجہ نہیں حاصل کر سکتا مگر ولایت (اللہ کا مقرب بندہ ہونا) تو اکتسابی امر ہے، جو شخص اللہ کی راہ میں کوشش کرے گا اتباعِ احکام اور سنت نبوی کی پیروی میں ممتاز ہوگا، اللہ اس کو تقرب کی نعمت بخشے گا، جیسا کہ قرآن کریم میں وارد ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (روم — ۶۹)

(اور جن لوگوں نے ہمارے لیے کوششیں کیں ہم ان کو ضرور اپنے راستے دکھا دیں گے۔)

تمام راستے کھولنے کا مطلب یہی ہے کہ نبوت کے سوا جو مراتب بھی ہیں وہ حاصل ہو سکتے ہیں۔

— اور:

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (بنی اسرائیل — ۲۰)

(ہم ان کو اور ان کو، سب کو تمہارے پروردگار کی بخشش سے مدد دیتے ہیں، اور تمہارے پروردگار کی بخشش کسی سے رُکی ہوئی نہیں ہے۔)

لیکن باوجود اس درجہ صریح آیات کے کچھ لوگ ولایت کو بھی نبوت پر قیاس کرتے ہیں اور اس کو

محض خدا کی دین سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ درجہ بھی کوشش و جد وجہد سے حاصل نہیں ہو سکتا، اور کہتے ہیں:

ایں سعادت بہ زور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(یہ سعادت زور بازو سے نہیں مل سکتی، جب تک کہ بخشنے والا خدا نہ بخش دے۔)

ان کی دلیل یہ ہے کہ توفیق اللہ ہی عطا فرماتا ہے، ورنہ کوئی جد وجہد نہیں کر سکتا۔

یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے۔ لیکن یہ بات ہر کمال کے لیے کہی جا سکتی ہے، تقرب الی اللہ کے لیے جو جد وجہد عند اللہ مطلوب ہے، وہ اسی وقت آدمی انجام دے گا جب توفیق الٰہی شامل حال ہو لیکن اس کی وجہ سے کسی درجۂ تقرب کو نبوت سے مشابہ نہیں قرار دیا جا سکتا، اصطلاحی اور قانونی زبان میں بھی کہا جائے گا کہ نبوت و رسالت محض وہبی عطیۂ خداوندی ہے اور اس کے بعد جو درجات بھی ہیں وہ اکتسابی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اکتساب کی ہمت بھی محض توفیق الٰہی سے ہوتی ہے۔

كَمْ اَبْرَأَتْ وَصِبًا بِاللَّمْسِ رَاحَتُهُ   وَاَطْلَقَتْ أَرِبًا مِنْ رِبْقَةِ اللَّمَمِ

(آپ کے دستِ مبارک نے لمس کے ذریعہ (چھوکر) نہ جانے کتنے بیماروں (دکھیاروں) کو شفا دی اور نہ جانے کتنے) ایسے مریض و مجنون تھے جن کو آپ کے ہاتھوں عاقبت نصیب ہوئی۔)

اس شعر میں اُن معجزات کی طرف اشارہ ہے، جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ہاتھ پھیر دینے سے بیماروں کے شفا پانے کا ذکر ہے، روایت ہے کہ غزوۂ احد کے موقع پر حضرت قتادہؓ کی آنکھیں حلقۂ چشم سے نکل کر ان کی ناک کے بانسے پر لٹک رہی تھیں، اس حالت میں ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور لایا گیا، آپؐ نے ان کی آنکھوں کو ان کے حلقۂ چشم میں رکھ دیا اور وہ پہلے کی طرح (بلکہ اس سے بہتر طریقہ پر، جیسا کہ بعض روایات میں ہے) کام کرنے لگیں۔

ایک عورت اپنے بیمار لڑکے کو لے کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس کے لڑکے کے سر پر زخم تھا، آپؐ نے اپنا دست مبارک اس پر رکھا — اور اللہ تعالیٰ نے اس کو شفا عطا فرما دی۔

ایک آدمی اوپر سے گر گیا، اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنا دستِ شفقت پھیرا، اور اس کی ٹانگ بالکل ٹھیک ہو گئی۔

محمد بن حاطب کے ہاتھ آگ سے جل گئے تھے، آپؐ نے دست مبارک اس پر رکھ دیا اور اسی

لمحہ وہ جلن دور ہو گئی اور آرام ہو گیا۔

شرحبیل الجعفی کی ہتھیلی میں زخم کے قسم کی کوئی تکلیف تھی جس کی وجہ سے وہ مٹھی نہیں بند کر سکتے تھے اور نہ تلوار پکڑ سکتے تھے اور نہ لگام تھام سکتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شفقت کے ساتھ ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا، جیسے مصافحہ کیا جاتا ہے۔ پھر کیا تھا وہ ہاتھ بڑے بڑے طاقت وروں کے ہاتھوں سے زیادہ مضبوط اور اس کی گرفت قیامت کی گرفت بن گئی۔ کتنے خوش نصیب تھے حضرت شرحبیل اور کتنی مبارک تھی وہ کوتہ دستی جس کو سرکار دو عالم کے دستِ شفقت کا لمس مل گیا، ہزاروں دراز دستیاں اس پر قربان!

[الفاظ کی تشریح : اَبْرَأَ : شفا دی وَصِبٌ : مریض، درد و الم میں مبتلا۔ أرِب : مریض، رِبْقَة گانٹھ۔ لَمَم گناہ صغیرہ۔ مراد جنون]

وَاَحْيَتِ السَّنَةَ الشَّهْبَاءَ دَعْوَتُهُ   حَتّٰى حَكَتْ غُرَّةً فِي الْاَعْصُرِ الدُّهُمِ

بِعَارِضٍ جَادَ اَوْخِلْتُ الْبِطَاحَ بِهَا   سَيْبٌ مِنَ الْيَمِّ أَوْ سَيْلٌ مِنَ الْعَرِمِ

(آپؐ کی دعا نے خشک سالی سے مردہ زمین کو زندگی بخشی یہاں تک کہ اس زمانہ میں جب ساری زمین قحط سے سیاہ ہو رہی تھی سبزہ سے لہلہا اٹھی اور چمک دار روشنی کے مشابہ ہو گئی۔)

(ایک بادل تھا (جو دعائے رسول سے چھا گیا تھا) جس نے موسلا دھار پانی برسایا اور مجھے ایسا لگا کہ وادیاں ایک سمندر کا بہاؤ بن گئیں یا وادی سیلاب کے پانی سے پُر ہو گئی۔)

[ان دونوں شعر کا معنی خیز ترجمہ یہی ہے جو اوپر کیا گیا، نحوی ترکیب اور الفاظ کے لغوی معانی کے لحاظ سے سَنَة قحط زدہ کو کہتے ہیں، شَهْبَاء ضرورت سے کم بارش، یا بہت معمولی بارش، غُرَّة کے معنی چمک کے ہیں، یہاں پر مراد سبزہ کی لہلہاہٹ سے زمین کی تابناکی ہے، دُهْم دھوپ سے جھلسے ہوئے سیاہ رنگ کو کہتے ہیں، اَدْهم اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کا رنگ سرخ سیاہی مائل ہو، عارض بادل کو کہتے ہیں، یہ لفظ قرآن کریم میں بھی آیا ہے، جَادَ کے معنی ہیں سخاوت کی، یہاں پر مراد ہے موسلا دھار بارش برسایا۔ بطاح، أبطح کی جمع ہے، کھلے میدان یا وادی کو کہتے ہیں، سَيْب

(س کو فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہے) جل تھل، سیل کے معنی ہیں سیلاب۔ عَرِم بھی وادی کو کہتے ہیں وہ سیلاب جو میدانوں کو ندی کی شکل میں بدل دے اس کو سَیْلُ العَرِم کہتے ہیں، نیز دعوتہ أحیت کا فاعل مؤخر ہے۔ دوسرے شعر میں بطاح مفعول اول اور سیب سیل مفعول ثانی ہیں خلتُ میں نے سمجھا، خیال کیا۔ انہ سیب أوسیل دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں 'أو' صرف عطف کے معنی میں ہے، یہ جائز ہے اور اس کی مثالیں ہیں۔]

ان دو شعروں میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جو مسلم اور بخاری دونوں نے روایت کی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک جمعہ کے روز جب کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر خطبہ دے رہے تھے ایک بدوی آیا اور اس نے کہا:

یارَسُوْلَ اللّٰہِ (صلی اللّٰہ علیہ وسلم) هَلَكَتِ الأَمْوَالُ وانْقَطَعَتِ السُّبُلُ فَادْعُ اللّٰہَ يُغِثْنَا۔

(یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! سارا مال تباہ ہو گیا، راستے کٹ گئے اللہ سے دعا کیجیے کہ ہماری مدد کرے۔)

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک دعا کے لیے اٹھایا اور تین بار فرمایا:

(اے اللہ ہماری فریاد سُن لے اور مدد فرما) جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمائی اس وقت آفتاب چمک رہا تھا اور دور دور کہیں بادل کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہیں آ رہا تھا، مگر اس دعا کے بعد ایسی بارش ہوئی کہ سات روز تک ہم لوگوں نے آفتاب کی شکل نہیں دیکھی، دوسرے جمعہ کو عین اس وقت جب کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے لیے منبر پر کھڑے تھے ایک بدوی آیا اور اس نے فریاد کی:

یَارَسُوْلَ اللّٰہِ (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) هَلَكَتِ الأَمْوَالُ وانْقَطَعَتِ السُّبُلُ فَادْعُ اللّٰہَ يُمْسِكْهَا عَنَّا۔

(یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! سارا مال تباہ ہو گیا اور راستے بند ہو گئے۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ اس بارش کو اب روک دے۔)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ہاتھ اٹھایا اور دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ حَوَالَيْنَا وَلَا عَلَيْنَا

(اے اللہ! یہ بارش ہمارے گرد و پیش (کے پہاڑوں) پر برسے اور ہم پر نہ برسے۔)

اس دعا کا کرنا تھا کہ آسمان سے بادل چھٹ گئے اور دھوپ نکل آئی، لوگوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ بارش روکنے کی دعا کے لیے جو شخص آیا تھا کیا یہ وہی شخص تھا جو پہلے جمعہ کو آیا تھا یا دوسرا تھا؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "مجھے معلوم نہیں"۔

دَعْنِيْ وَوَصْفِيْ اٰيَاتٍ لَهٗ ظَهَرَتْ ظُهُوْرَ نَارِ الْقِرٰى لَيْلًا عَلٰى عَلَمِ

فَالدُّرُّ يَزْدَادُ حُسْنًا وَهُوَ مُنْتَظِمٌ وَلَيْسَ يَنْقُصُ قَدْرًا غَيْرَ مُنْتَظِمِ

(مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بیان کرنے دو۔ وہ معجزات جو ایسے ظاہر ہوئے، جیسے پہاڑی پر روشن کی جانے والی آگ ظاہر ہے۔)

(موتیاں اگر لڑی میں پروئی ہوئی ہوں تو بھلی لگتی ہیں۔ لیکن اگر پروئی ہوئی نہ ہوں تو بھی ان کے حُسن میں کمی نہیں آتی۔)

شاعر قصیدہ حضرت بوصیریؒ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بیان کر رہے ہیں اور ایک ایک معجزہ کا ذکر ذوق و شوق کی زبان میں، وارفتگی و فدائیت کے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ کا ذکر ہی ان کے لیے جاں بخش ہے، روح کی غذا اور دل کی ٹھنڈک ہے، اس ذکر معجزات کے درمیان ان کو خیال ہوتا ہے کہ کہیں کوئی یہ اعتراض نہ کرے کہ جو بات حد درجہ روشن اور واضح ہے، جس کو اہل نظر خوب سمجھتے ہیں، اس کو بیان کرنے سے حاصل؟ بات تو وہ بتائی جاتی ہے جو پوشیدہ ہو، کوئی راز ہو، جس کے جاننے والے کم ہوں۔ مگر جو باتیں اس قدر عام ہیں اور اس درجہ کھل کر نگاہوں کے سامنے آچکی ہیں جیسے پہاڑی پر کوئی آگ روشن کرے تو وادی میں رہنے والے سب اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس عام، روشن اور واضح چیز کو دہرانے کا فائدہ؟

پہاڑی پر آگ روشن کرنا قدیم شرفائے عرب کا دستور تھا، جب کوئی وہ دعوت کرتے تو اس زمانہ میں جس طرح دعوت نامے بھیجے جاتے ہیں، یا زبانی پیغام دیا جاتا ہے، یا عمومی دعوت ہو تو اشتہار و اعلان سے کام لیا جاتا ہے، اس زمانہ میں لوگ ایسا کرتے تھے کہ پہاڑ پر کچھ خشک پتے اور لکڑیاں جلا دیتے اس کے شعلے اٹھتے، ان سے روشنی ہوتی اور لوگ سمجھ لیتے کہ آج اس پہاڑی کے دامن پر کوئی

اونٹ حلال کیا گیا ہے اور سب کے لیے دعوت کا اعلان ہے۔

بہر حال حضرت بوصیریؒ پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ : اے میرے ہم نفس، میرے رفیق، میرے دمساز (جس طرح چاہیے خطاب کر لیجیے) مجھے حضورؐ کی مدح بیان کرنے میں مزہ آرہا ہے، یہ میری روح کی غذا ہے۔ مجھے اس سے نہ روکو، چھوڑ دو مجھے میرے حال پر، کہنے دو جہاں تک کہہ سکتا ہوں، اب رہا تمھارا یہ اعتراض کہ جو بات خود واضح ہے اس کو بتانے کی کیا ضرورت، اس کو نظم کرنے کا حاصل؟ اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح اہل ایمان کے سامنے؟ شاعر اس وسوسہ کا جواب دیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات سچے موتیوں کی طرح آب دار ہیں، لیکن اگر ان کو نظم کی لڑی میں پرو دیا جائے تو آنکھوں کو زیادہ بھلے معلوم ہوتے ہیں — یوں اگر ان کو نظم نہ کیا جائے اور ہر موتی اپنی جگہ پر بکھری ہوئی ہو جب بھی ان کی خوب صورتی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

لیکن اصل بات جو چھپائے نہیں چھپ رہی ہے اور جو تاویلات کے پردوں سے بھی جھلک رہی ہے وہ یہ کہ شاعر حضرت بوصیریؒ اپنے کعبۂ قلب و نظر قبلۂ محبوبیت و فدائیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنا چاہتے ہیں ان کے معجزات بھی اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ اس بہانہ سے آپؐ کی ذات گرامی کا ذکر ہو رہا ہے۔

دعنی و وصفی آیات مجھے ان کی نشانیاں بیان کرنے دو — کا لہجہ بتا رہا ہے کہ ذکرِ حبیب، کو ذوق حضوری، میں طول دینا چاہتے ہیں۔

فَمَا تَطَاوَلُ آمَالُ الْمَدِيحِ إِلَى مَا فِيهِ مِنْ كَرَمِ الْأَخْلَاقِ وَالشِّيَمِ

(آرزوے ثنا خوانی کے بقدر آپ کے اخلاق کریمانہ اور خصال حمیدہ کو بیان بھی نہیں کیا جا سکتا۔)

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دل تو چاہتا ہے کہ آپؐ کا ذکر کبھی ختم نہ ہو، آپ کے تمام خصائل و فضائل کو بیان کروں، اور بیان کرتا رہوں، ایک ایک ادا پر سو سو جان سے قربان ہو جاؤں۔ اگرچہ 'جان' بھی آپ کے حضور کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ بقول حافظ شیرازی کے :

جاں نذر محقر است حافظ
از بہر نثار خوش نہ باشد

(جان ایک حقیر نذرانہ ہے۔ مگر آپ پر نثار کرنے کے لیے شایان شان نہیں ہے)

لہٰذا میں کیا اور میری آرزوے مدح خوانی کیا۔ یہ حجت کہ آپ کے اخلاق و فضائل کو بیان کر ڈالوں کیونکر ممکن ہے۔ (فما تطاول الخ استفہام انکاری ہے)

آيَاتُ حَقٍّ مِنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثَةٌ قَدِيمَةٌ — صِفَةُ الْمَوْصُوفِ بِالْقِدَمِ

خدائے رحمٰن کی بخشی ہوئی سچی نشانیاں (قرآن کریم کی آیات) ہیں جو باعتبار نزول کے تازہ ہیں اور باعتبار حقیقت و معنویت کے قدیم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک جس کی صفت قدیم ہے اسی کی یہ صفت ہے۔)

قرآن کریم اللہ کا کلام ازلی و ابدی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی و سرمدی معجزہ ہے، اس کی آیات نزول کے اعتبار سے تازہ اور نو بہ نو ہیں، اگرچہ اپنے معنی اور حقیقت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی صفت ہونے کے لحاظ سے قدیم ہیں۔

اس شعر میں ذرا لفظی اور معنوی پیچیدگی ہے۔ 'آیات حق' سے مراد معجزہ قرآن ہے۔ مُحْدَثَةٌ کے معنی ہیں نیا اور تازہ — اور قَدِيمَةٌ کے معنی ہیں جس کی کوئی ابتدا نہ ہو۔ (قدیم بلا ابتداء) یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں — مگر شاعر کا مقصد یہ بتانا ہے کہ قرآن کریم لوح محفوظ میں تو قدیم ہے مگر دنیا میں اس کا نزول سب کے سامنے تازہ ہے — اور مُحْدَث کا لفظ خود قرآن میں وارد ہے :

مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ۝ (سورہ انبیاء آیت ۲)

(ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس جو بھی تازہ نصیحت آتی ہے اسے وہ اس حال میں سنتے ہیں کہ ہنسی کرتے ہوتے ہیں۔)

اور سورۂ شعراء میں ہے :

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ۔ (۵/۲۶)

(اور ان کے پاس تازہ فہمائش خدائے رحمٰن کی طرف سے ایسی نہیں آتی کہ یہ اس سے بے رخی

نہ کرتے ہوں۔)

شیخ بوصیریؒ کے شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر یہی آیت رہی ہوگی۔ "مِنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثَةٌ" کا ٹکڑا اسی آیت سے ماخوذ ہے۔

لَمْ تَقْتَرِنْ بِزَمَانٍ وَهِيَ تُخْبِرُنَا عن المعادِ، وعن عادٍ، وعن إرَمِ

یہ آیات قرآنیہ جو رسول اللہ کا معجزہ ہیں کسی زمانہ سے مربوط نہیں ہیں، یہ ایک طرف آئندہ پیش آنے والے حالات آخرت کی خبریں دیتی ہیں تو دوسری طرف ماضی کی داستان، عاد کے قصے اور اِرم کی داستان بھی سناتی ہیں۔

یعنی قرآن کریم ایک سدابہار صحیفۂ ہدایت ہے، زمان ومکان کی حدبندیوں سے بلند ہے۔ لیکن فلسفیانہ موشگافیوں نے چند لغو قسم کی بحثیں شروع کر رکھی تھیں، جن میں ایک یہ ہے کہ قرآن میں عبرت کے لیے ان قوموں کے احوال مذکور ہیں جو کبھی روئے زمین پر آباد تھیں، اور ان کو نافرمانی اور عدم اطاعت کی پاداش میں ہمیشہ کے لیے فنا کر دیا گیا۔ دوسری طرف اسی قرآن میں مستقبل انسانیت کی خبر ہے، حشر ونشر، جنت وجہنم سے متعلق تفصیلات ہیں۔ لہٰذا قرآن کا تعلق 'زمانہ' ماضی اور مستقبل دونوں سے ہے۔ اور جو شئے زمانہ سے مربوط ہے وہ حادث ہے، قدیم نہیں ہوسکتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ 'زمانہ سے مربوط' اس کو کہتے ہیں جو کسی ایک زمانہ ماضی یا حاضر سے مربوط ہو۔ مگر قرآن صرف ایک 'زمانہ' کی بات نہیں کرتا بلکہ ماضی حال مستقبل، انسانی نفسیات، تکوینی قوانین، سب ہی پر حکمرانی کرتا ہے، لہٰذا اگرچہ اس میں ماضی کی داستان ہے اور مستقبل کے خطرات سے آگاہی دی گئی ہے، پھر بھی وہ زمانہ سے مربوط نہیں ہے بلکہ زمانہ اس کے جلو میں چلتا ہے اور اس کا تابع ہے۔

عاد سے قوم عاد مراد ہے جن کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا اور اِرَمْ بھی اسی قبیلہ کا دوسرا نام ہے جو ان کے اجداد کا خاندانی لقب تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بستی جس میں یہ قوم آباد تھی اس کا نام اِرَمْ تھا، "اِرَم ذَاتِ العِمَاد" (گنبدوں والی بستی ارم) اسی سرزمین کو کہا گیا ہے۔

دَامَتْ لَدَيْنَا فَفَاقَتْ كُلَّ مُعْجِزَةٍ مِنَ النَّبِيِّيْنَ إِذْ جَاءَتْ وَلَمْ تَدُمِ

(قرآن کریم کا معجزہ تسلسل کے ساتھ ہماری ہدایت کے لیے ہمیشہ موجود رہتا ہے اور اس لحاظ سے یہ معجزہ دوسرے انبیائے کرام کے معجزوں سے بڑھ گیا ہے کیوں کہ ان کے جو معجزے ظاہر تو ہوئے مگر پائیدار نہ تھے۔)

مطلب یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے تمام معجزے برحق ہیں، اور ہر معجزہ نبوت کی دلیل تھا، لیکن وہ معجزے وقتی تھے اور ایک محدود وقت میں اور ایک محدود جگہ پر اپنی تابانی دکھا کر ختم ہوگئے اور ان کے اظہار کا مقصد بھی اسی قدر تھا، لیکن قرآن کا معجزہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا، وہ ہر وقت تازہ، ہر دم جوان اور ہر لمحہ رواں ہے، ہر زمانہ اس کا زمانہ ہے، ہر صبح اس کی صبح ہے جس کی کوئی شام نہیں۔

معجزہ 'لغت کے لحاظ سے اس شئے کو کہتے ہیں جو انسانی عقل وفکر کو بے بس کر دے' جس کی کوئی منطقی توجیہ، فلسفیانہ تاویل ممکن نہ ہو، دستور ونظام فطرت کے خلاف کسی شئے کا ظاہر ہونا، مثلاً گوشت وپوست سے بنے ہوئے انسان کی ہتھیلی آفتاب کی طرح چمکنے لگے، اور یہ جادو اور نظر بندی بھی نہ ہو، کیونکہ جادو سے حقیقت بدلا نہیں کرتی صرف انسان کی آنکھ دھوکہ کھا جاتی ہے، اور اس فرق کو خود قرآن نے واضح کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب معجزۂ خداوندی لے کر فرعون کے دربار میں گئے تو فرعون نے کہا کہ یہ تو جادو کا کرشمہ ہے اور جادوگر تو ہماری مملکت میں بھرے پڑے ہیں۔ چنانچہ اس نے جادوگروں کو بلایا اور جو معجزہ حضرت موسیٰ کا تھا بعینہٖ وہی کرشمہ ان جادوگروں نے دکھایا' اپنی رسیاں میدان میں ڈال دیں اور ہر رسی سانپ بن کر بل کھانے لگی۔ ادھر حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ آپ بھی اپنا عصا میدان میں چھوڑ دیں، وہ اژدہا بن کر جادوگروں کی رسیاں نگلنے لگا۔ جادوگر فن جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ نظر بندی کیا ہے، سحر کس کو کہتے ہیں، ان کو یقین ہوگیا کہ موسیٰ نے جو مظاہرہ کیا ہے وہ جادو نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ وہ فوراً سربسجدہ ہوکر اعلان کرنے لگے:

"آمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى"

(ہم تو ہارون وموسیٰ کے رب پر ایمان لاتے ہیں)

لیکن یہ سب معجزے باوجود اس کے کہ وہ نبوت کی دلیل کے طور پر پیش کیے گئے اور ان کے حق ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے مگر سب وقتی تھے، ان کے لیے حجت تھے جو اس زمانہ میں موجود تھے

اور جنہوں نے ان معجزات کا مشاہدہ کیا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معجزہ مرحمت فرمایا وہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے یکساں طور پر قائم رہے گا۔

مُحْكَمَاتٌ، فَمَا تُبْقِيْنَ مِنْ شُبَهٍ لِذِيْ شِقَاقٍ، وَمَا تَبْغِيْنَ مِنْ حَكَمٍ

(اور یہ آیات کریمہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی دلیل اور آپ کی نبوت کا دائمی معجزہ ہیں) ہر طرح سے ٹھوس ہیں، یا حکمت و دانائی کی باتوں سے بھری ہوئی ہیں، اور ان کے ٹھوس ہونے کا یہ حال ہے کہ کوئی جھگڑالو (نہ ماننے والا) شک و شبہ کرنے کی گنجائش اس کے اندر نہیں پاسکتا اور اس درجہ واضح اور روشن دلائل اس کے اندر موجود ہیں کہ ان آیات کو کسی حاکم یا ثالث کے فیصلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ (مطلب یہ ہے کہ حاکم سے فیصلہ یا ثالث سے تصفیہ کرانے کی ضرورت تو جب ہو کہ اس کی صداقت میں شُبہ ہو۔ جب روز روشن سے زیادہ روشن حقیقت سامنے ہے تو پھر کسی کی ثالثی یا گواہ کی کیا حاجت۔)

لفظ مُحکَمات کو بغیر تشدید کاف کے مُحکَماتٌ بھی پڑھ سکتے ہیں، جس کے معنی پختگی اور مکمل ہونے کے ہیں، اس کا مفہوم یہ ہے کہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے، معانی کے لحاظ سے، رشد و ہدایت کا صحیفہ ہونے کے لحاظ سے یہ مکمل ترین کتاب ہے۔ ٹھوس ہے، کہیں سے ڈھیلا پن، ناہمواری نہیں ہے، کہیں سے نہ مفہوم گنجلک ہے اور نہ معنی میں نقص و فتور ہے۔ قرآن کریم نے بطور چیلنج کے کہا ہے:

"وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔

(اور تم اس کتاب کے بارے میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر اتاری ہے تو کوئی ایک سورت اس جیسی تم بھی بنا لاؤ)

اور جس کا جواب نہ اس وقت کسی نے دیا تھا جب قرآن کریم نازل ہو رہا تھا اور نہ بعد میں کسی کی ہمت ہوئی۔

فَمَا حُوْرِبَتْ قَطُّ اِلَّا عَادَ مِنْ حَرْبٍ اَعْدَى الْاَعَادِيْ اِلَيْهَا مُلْقِيَ السَّلَمِ

(ان آیات کریمہ کی جب بھی مخالفت کی گئی، تو نتیجہ ہمیشہ یہی نکلا کہ بڑے سے بڑے

دشمن بھی سرنگوں ہو کر اور صلح کے جویا بن کر واپس گئے۔

شارح قصیدہ شیخ ابراہیم الباجوری لکھتے ہیں کہ مَا حُوْرِبَتْ نہیں جنگ کی گئی، یا نہیں مخالفت کی گئی سے مراد آیات کریمہ نہیں بلکہ وہ ذات گرامی ہے جو ان آیات کریمہ کو لے کر آئی، یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور شاعر کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ سے جب بھی کسی نے دشمنی کی ٹھانی وہ پسپا ہوا، اور صلح کی درخواست کرنے کے علاوہ اس کے سامنے کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا۔

بہرحال اس شعر میں آیات کی طرف اشارہ ہو، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دونوں کا مفہوم یہی ہے۔ حضور اکرم خود قرآن ناطق تھے، اور قرآن، حقیقتِ محمدیہ کا نام ہے۔

نگاہِ جذب و مستی میں وہی اول وہی آخر وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

رَدَّتْ بَلَاغَتُهَا دَعْوَى مُعَارِضِهَا رَدَّ الْغَيُوْرِ يَدَ الْجَانِيْ عَنِ الْحُرَمِ

(ان آیات کریمہ کی بلاغت نے مقابلہ کا دعویٰ کرنے والوں کو اس طرح نامراد واپس کیا جیسے کوئی صاحبِ غیرت اپنے گھر کی حرمت پر حملہ کرنے والے ہاتھ کو پسپا کر دے۔)

(حُرَم جمع حُرْمَةٌ محرم عورتیں)

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ایک صاحبِ غیرت انسان کو اپنی بیوی بیٹی کی عزت جس طرح عزیز ہوتی ہے کہ اگر ان پر کوئی حملہ آور ہو تو وہ اپنی جان پر کھیل جاتا ہے اور دشمن کے ناپاک ارادوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتا، اسی طرح قرآن پر کسی نے حملہ کیا اور اس کی کسی سورت یا آیت کا اپنے کلام سے مقابلہ کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی ہمت پست کر دی اور اس کو محروم و نامراد لوٹا دیا۔

لَهَا مَعَانٍ كَمَوْجِ الْبَحْرِ فِيْ مَدَدٍ وَفَوْقَ جَوْهَرِهٖ فِي الْحُسْنِ وَالْقِيَمِ

فَمَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰى عَجَائِبُهَا وَلَا تُسَامُ عَلَى الْاِكْثَارِ بِالسَّأَمِ

(ان آیات کریمہ کے معانی دریا کے موج کی طرح ہیں کہ ایک موج آگے بڑھتی ہے تو دوسری موج پیچھے سے آکر دریا کی روانی کو باقی رکھتی ہے، اور اس دریا سے نکلنے والے جواہرات کے حُسن اور ان کی قیمت و اہمیت سے کہیں زیادہ وہ حُسن و جمال ہے جو قرآن کریم میں ہے)

(قرآن پاک کے عجائب اور اس کے معانی کا تنوع ایسا نہیں ہے جو شمار کیا جا سکے، اور اس کو جتنا بھی پڑھا جائے اس کی تازگی میں فرق نہیں آتا اور کثرتِ تلاوت سے اکتانے

اور بار بار پڑھنے سے 'پامال' ہونے کی کیفیت اس کے اندر نہیں پائی جاتی۔

قرآن کریم کے معانی پر کسی انسان کو آج تک عبور نہیں حاصل ہوا، باجوری نے کسی عالم کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن پاک میں جو علوم ہیں ان کی تعداد کم از کم ۲۴ ہزار آٹھ سو ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مقولہ نقل کیا ہے کہ صرف سورۂ فاتحہ کی تفسیر اگر بیان کروں تو ستر اونٹ درکار ہوں گے جو ان تفسیروں کا بوجھ برداشت کر سکیں۔ بعض اہلِ معرفت کا ارشاد ہے کہ صرف سورۂ فاتحہ پانچ خزانوں پر مشتمل ہے اور ہر خزانہ تفسیر کے لیے ایک عمر کا طالب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نام پاک (الحمد للہ میں) ایک خزانہ ہے۔ ربوبیت، ملکیت، رحمانیت اور ہدایت بخشی۔ یہ سب خزانوں کے نام ہیں۔

دوسرے شعر میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن عجائب کا خزانہ ہے۔ ہر زمانہ میں ہر شخص کو کوئی نہ کوئی نیا نکتہ مل جاتا ہے، کوئی ایسا پہلو مل جاتا ہے جس کے ذریعہ وہ خدمتِ قرآن کرے، صدیوں پر صدیاں گذرتی جا رہی ہیں اور قرآن ہے کہ پرانا نہیں ہوتا۔ کوئی اچھا سے اچھا شعر پڑھیے، دو چار بار آپ دہرائیں گے جس سے لطف آئے گا، زیادہ سے زیادہ پچیس پچاس مرتبہ آپ دہرائیں گے، پھر وہ شعر پامال ہو جائے گا مگر قرآن کو دیکھیے کہ صدیوں سے پڑھا جا رہا ہے، ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے، ہر تراویح میں دہرایا جاتا ہے، ہر تلاوت میں دہرایا جاتا ہے، خوشی کی بات ہو تو قرآن پڑھا جاتا ہے، غم ہو تو قرآن پڑھا جاتا ہے، یوں بھی لاکھوں لاکھ انسان ہر سکنڈ بلکہ ہر پل قرآن پڑھ رہے ہیں۔ آفتاب ماہتاب کی گردش ہو یا زمین کی گردش، کوئی لمحہ ایسا نہیں آپ سوچ سکتے جس وقت کہیں نہ کہیں فرض نماز ہو رہی ہو اور ہر لحہ لاکھوں انسان روئے زمین پر قرآن پڑھ رہے ہوں گے اور اس کے باوجود کبھی آیت قرآن سن کر یا پڑھ کر آدمی اکتاتا نہیں ہے، بلکہ ہزار بار سننے کے بعد بھی اہلِ ایمان کی آنکھیں بھر آتی ہیں اور کسی آیت کو دہرانے میں خاص لذت اور کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

قَرَّتْ بِهَا عَيْنُ قَارِيهَا فَقُلْتُ لَهُ … لَقَدْ ظَفِرْتَ بِحَبْلِ اللّٰهِ فَاعْتَصِمِ

اِنْ تَتْلُهَا خِيفَةً مِنْ حَرِّ نَارِ لَظَى … أَطْفَأْتَ نَارَ لَظَى مِنْ وِرْدِهَا الشَّبِمِ

تلاوت کلام پاک کرنے والے کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں تو میں نے کہا تم نے اللہ کی مضبوط رسی پکڑ لینے میں کامیابی حاصل کر لی، اب اس کو تھامے رہنا، چھوڑنا نہیں۔ اگر تم آتشِ جہنم کے خوف سے اس کی تلاوت کرتے ہو تو سمجھ لو کہ آیات کریمہ کی تلاوت کی ٹھنڈک

سے تم نے آتشِ جہنم کو بجھا دیا۔

شبم ٹھنڈک کو کہتے ہیں۔ لظی جہنم (غیر منصرف بسبب علم و تانیث) دوسرے شعر میں نار لظی کو دوسرے مصرعہ میں بھی صراحۃً ذکر کیا ہے حالانکہ یہ مقام ضمیر کا تھا۔ مگر ضرورت شعری کی وجہ سے ایسا کرنا فصاحت کے خلاف نہیں ہے۔ اشعار کے مفہوم واضح ہیں، اس کی تلاوت سے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے، اس کے اندر وہ ٹھنڈک ہے جو آتش جہنم کو سرد کر دے جس نیت سے جس نے تلاوت کی اپنی مراد پائی۔

(اگر ان آیات کی تلاوت دوزخ کی آگ کے خوف سے، اس سے بچنے کے لیے تم نے کی ہے تو اطمینان رکھو کہ تم نے ان آیات کے ٹھنڈے مقام پر پہنچ کر جہنم کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔)

اس شعر میں اس حدیث نبوی کی طرف اشارہ تھا جس کو امام مسلم نے باب السورع میں نقل کیا ہے:

اقرؤا القرآن فانه يأتي يوم القيامة شفيعًا لأصحابه یعنی قرآن پڑھا کرو کیونکہ وہ قیامت کے روز اپنے پڑھنے والوں کی شفاعت کرے گا۔

كَأَنَّهَا الْحَوْضُ تَبْيَضُّ الْوُجُوهُ بِهِ … مِنَ الْعُصَاةِ، وَقَدْ جَاؤُوكُمْ كَالْحُمَمِ

(قرآنی آیات گویا کہ ایک (پانی کا) حوض ہے جس سے نافرمانوں کے چہرے دھل کر صاف ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ (اے حوض) جس وقت یہ لوگ آتے ہیں ان کے چہرے کوئلوں کی طرح سیاہ ہوتے ہیں۔)

چہرہ کا اجالا ہونا کنایہ ہے انعام پانے کی مسرت سے، جس سے انسان کا چہرہ کھل اٹھتا ہے، اور سیاہ ہونا غم واندوہ کی علامت ہے۔ معصیت سے آدمی روسیہ ہوتا ہے اور اطاعت سے اس کے چہرہ پر نور آجاتا ہے، قرآن کریم کی تلاوت کرنا ایسا ہے جیسے کوئی پانی کے چشمے یا حوض پر جا کر اپنے منہ کی کالک دھو ڈالے اور سیاہ چہرہ کو جو معصیت کی وجہ سے کوئلوں کی مانند ہو گیا تھا، اس کو روشن بنا لے۔

وجوہ چہرہ کو کہتے ہیں اس کا مفرد وجہ مراد وجود انسانی ہے حُمَم، حُمَمَة کی جمع

ہے، کوئلے کی وہ قسم جو بہت سیاہ ہو۔

وَكَالصِّرَاطِ وَكَالْمِيزَانِ مَعْدِلَةً فَالْقِسْطُ مِنْ غَيْرِهَا فِي النَّاسِ لَمْ يَقُمِ

(یہ قرآن پل صراط کی طرح ہے یا ترازو کی طرح ہے جو دونوں پلوں کو اتفاق کے ساتھ برابر کرتا ہے وہ انصاف جو اس میزان (ترازو) کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتا۔)

صراط سے مراد وہ پل ہے جس کا ذکر احادیث میں آیا ہے، جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہوگا، اور اللہ کے صالح بندوں کے لیے وہ وسیع شاہراہ ہوگی، کچھ لوگوں کے لیے انتہائی تنگ، کچھ لوگوں کے لیے بہت وسیع، کچھ لوگ اس کو پار کر کے جنت میں جائیں گے۔ اور بعض لوگوں کو وہ جہنم واصل کرے گا۔ لہٰذا قرآن کریم بھی اسی صراط کی مانند ہے کہ جس طرح بعض تشبیہات سے لوگوں کی گمراہیوں میں اضافہ ہوتا ہے اور بعض لوگوں کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

قرآن کریم کی دوسری تشبیہ 'میزان' ترازو سے دی گئی ہے کہ وہ انصاف جو انسانوں کو کبھی اور تاریخ کے کسی دور میں نہ مل سکا وہ قرآن کریم سے حاصل ہوتا ہے وہ کھرے کھوٹے، حق و باطل، اور اچھے بُرے کو ظاہر کر دیتا ہے۔

لَا تَعْجَبَنْ لِحَسُودٍ رَاحَ يُنْكِرُهَا تَجَاهُلًا، وَهُوَ عَيْنُ الْحَاذِقِ الْفَهِمِ

(حاسد کے انکارِ قرآن پر تعجب نہ کرو کیونکہ وہ جان بوجھ کر انکار کر رہا ہے، اور حالانکہ وہ ہی چالاک اور سمجھ دار ہے۔)

قرآن کریم کے سلسلہ میں جو اوصاف اوپر ذکر کیے گئے ان کو پڑھ کر کوئی یہ شبہ ظاہر کر سکتا ہے کہ جب قرآن کریم اس درجہ باعظمت شئے ہے اور اس کے معانی اس درجہ بلند ہیں، اور اس کی تاثیر اس درجہ تیز ہے تو پھر عہدِ رسالت ہی کے لوگوں نے ان کا انکار کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حسد قلب کو سیاہ اور چشم بینا کو کور بنا دیتا ہے۔ حاسد اپنے فائدے اور نقصان کو بھول جاتا ہے اس کو بس اتنی فکر ہوتی ہے کہ دوسرے کو جو نعمت حاصل ہے وہ زائل ہو جائے، خواہ اس کو ملے یا نہ ملے، اس لیے کفارِ مکہ اگرچہ سمجھ دار تھے، اور کلام کی بلندی کے دل سے معترف تھے مگر ان کے حسد کا مادہ ان کو تجاہل عارفانہ پر مجبور کرتا تھا۔

لَا تَعْجَبَنْ (نہی۔ نون خفیفہ) رَاحَ يُنْكِرُهَا: ذَهَبَ يُنْكِرُهَا انکار کرنے لگا۔ تَجَاهُلًا:

واقف ہوتے ہوئے بھی ناواقف بن جاتا۔ حاذق: سمجھ دار، چالاک، سمجھ دار آدمی

یہاں تک قرآن کریم کے معجزہ کا بیان تھا، اس کے بعد جو اشعار آئیں گے اس میں شاعر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کریں گے۔

يَا خَيْرَ مَنْ يَمَّمَ الْعَافُونَ سَاحَتَهُ سَعْيًا، وَفَوْقَ مُتُونِ الْأَيْنُقِ الرُّسُمِ

وَمَنْ هُوَ الْآيَةُ الْكُبْرَى لِمُعْتَبِرٍ وَمَنْ هُوَ النِّعْمَةُ الْعُظْمَى لِمُغْتَنِمِ

(اے وہ بہترین ذات! جس کے درِ دولت پر مانگنے والے پاؤں پاؤں چل کر، اور کچھ لوگ تیز اونٹنیوں کی پیٹھوں پر بیٹھ کر جایا کرتے ہیں۔)

(اور اے وہ ذات گرامی! جو صاحبِ بصیرت کے لیے کھلی نشانی ہے اور وہ جو نورِ ہدایت کے جویا کے لیے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت عُظمیٰ ہے۔)

ان دونوں اشعار میں نبی کریم أرواحنا فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص عربی انداز میں مخاطب کیا گیا ہے۔

اندازِ خطاب لفظی ترجمہ سے واضح نہیں ہوگا، اس لیے اس کو ذرا اور بسط کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

"جن لوگوں کے دروں پر حاجت مند اپنی حاجت روائی کے لیے جایا کرتے ہیں ان میں سب سے زیادہ داد دہش میں معروف شخصیت والے۔ ان سب پر فائق اور ان سب میں بہتریں وجود والے جس کے دریائے سخاوت سے بہرہ مند ہونے کے لیے کچھ لوگ پیادہ پا، کچھ سواریوں پر جایا کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "میرے گھر کا قصد کرنے کی دعوتِ عام دو، لوگ آئیں گے، کچھ پیدل چل کر آئیں گے (رِجَالًا) اور کچھ لوگ سواریوں پر آئیں گے، اور جن کے پاس مضبوط قسم کے اونٹ نہ ہوں گے تو مریل اور کمزور ہی اونٹ پر سہی مگر آئیں گے، اور جن کے راستے ہموار نہ ہوں گے اور نشیبی علاقوں سے آنا پڑے گا جہاں چڑھائی پر چلنے سے مضبوط اور توانا اونٹ بھی ہمت ہار جاتے ہیں وہاں کمزور اور نڈھال قسم کے اونٹ پر کونے اور گوشے گوشے سے آئیں گے۔" کچھ اسی قسم کی بات شیخ بوصیریؒ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ آپؐ کے درِ دولت پر آنے کے لیے جس کے پاس سواری ہوگی، وہ سواری سے آئے گا اور جو

پاپیادہ دوڑ کر آسکے گا آئے گا اور آتا رہاہے کیونکہ آپ کا وجودِ گرامی بذاتِ خود مظہرِ عنایاتِ خداوندی ہے، جس نے آپ کو دیکھ لیا، ایمان لے آیا کیونکہ آپ بذاتِ خود ایک معجزہ اور اللہ کی نشانیوں میں سے بڑی نشانی ہیں، آپ کا وجود اللہ کی نعمت اور عظیم نعمت ہے۔''

الفاظ کی شرح: یَمَّمَ: قصد کیا، ارادہ کیا۔ ساحۃ: گھر کے آنگن یا صحن کو کہتے ہیں، مراد مکان کا وہ حصہ جہاں سائل آکر کھڑے ہوتے ہیں۔ سَعیًا حال ہے یَمَّمَ کا، دوڑ کر آنا، پاپیادہ چل کر آنا۔ مُتُون جمع ہے متن کی، پیٹھ۔ اَیْنُق ناقہ کی جمع (خلافِ قیاس) ہے، بظاہر جمع اُنوق ہے۔ مگر واؤ کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ مُعْتَبِر عبرت حاصل کرنے والا، عبرت حاصل کرنے کا عام مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کسی نکبت، مصیبت یا تکلیف دہ منظر کو دیکھ کر آدمی عبرت حاصل کرے اور وہ کام نہ کرے جس کی وجہ سے کوئی گرفتارِ الم ہوا ہے۔ مگر لفظی معنی میں بصیرت حاصل کرنا۔ معتبِرُ (ب کو زیر) صاحبِ بصیرت کو کہتے ہیں، یہاں بھی لفظی معنی اسی مفہوم میں وارد ہوا ہے۔ حافظ شیرازی کا ایک شعر ہے:

ناظر روئے تو صاحب نظر انند آرے — سر گیسوئے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

یعنی آپ کے جمالِ جہاں آرا کے دیکھنے والے تو بڑے صاحبِ نظر و بصیرت لوگ ہیں، مگر کوئی سر ایسا نہ ہوگا جس میں آپ سے والہانہ تعلق کا سودا نہ ہو۔ مغتنم غنیمت حاصل کرنے والا۔ یعنی فائدہ اٹھانے والا۔

اس تخاطب کے بعد شیخ بوصیریؒ واقعۂ معراج کا ذکر شروع کرتے ہیں، اور پیرایہ بیان یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو براہِ راست مخاطب کرتے ہیں:

سَرَيْتَ مِنْ حَرَمٍ لَيْلاً إِلَى حَرَمٍ — كَمَا سَرَى الْبَدْرُ فِي دَاجٍ مِنَ الظُّلَمِ

وَبِتَّ تَرْقَى إِلَى أَنْ نِلْتَ مَنْزِلَةً — مِنْ قَابَ قَوْسَيْنِ لَمْ تُدْرَكْ وَلَمْ تُرَمِ

(آپ راتوں رات ایک حرم سے دوسرے حرم تک چلے گئے، جیسے چودھویں کا چاند تاریک رات کی شدید تاریکی میں اپنے منازل طے کرتا ہے۔)

(اور آپ مسلسل بلندیوں کی طرف بڑھتے ہی رہے یہاں تک کہ قاب قوسین (دو تیروں کی مسافت) کا درجہ حاصل کرلیا۔ وہ درجہ آپ سے پہلے کسی نے پایا نہیں اور نہ کسی

کا حوصلہ ہوا کہ اس کی طلب کرتا۔)

معراج کی حدیث چونکہ بہت مشہور ہے اس لیے تفصیل سے یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

شاعرِ نبوی حضرت بوصیریؒ والہانہ انداز میں اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! آپ کعبہ مشرفہ سے بیت المقدس تک ایسے گئے جیسے چودھویں کا چاند اپنے منازل طے کرتا ہے، چاند سے ٹھنڈک، روشنی اور دل آویزی میں تشبیہ دی جاتی ہے۔ قاب قوسین کا ترجمہ ہے دو کمانوں کی مسافت، سورۂ نجم میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل کو اتنی قریب کی مسافت سے دیکھا کہ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آپؐ کے اور فرشتہ کے درمیان دو کمانوں کا فاصلہ ہے، جس طرح ہم لوگ اردو میں بولتے ہیں دو بالشت کی مسافت، دو قدم کی دوری۔ قرآنی زبان میں فاصلہ کے کم ہونے کو دو بالشت کے بجائے دو تیروں کی مسافت کہتے ہیں۔

کسی پیغمبر نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصلی ہیئت میں اور اتنے قریب سے نہیں دیکھا جس قدر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا۔

اسرا اور معراج کے دو علیحدہ بیانات ہیں: 'اسراء' کے معنی ہیں رات کو لے جانا، (مادہ سریٰ یسری سُریٰ) رات کو جانا۔ لَیْلاً سے مزید تاکید ہوتی ہے کہ فعل اپنے اصلی معنی میں مستعمل ہوا ہے، اور مجاز نہیں ہے۔

یہ واقعہ سورۂ الاسراء میں مذکور ہے کہ راتوں رات ایک حرم (کعبہ) سے دوسرے حرم (بیت المقدس) تک اللہ تعالیٰ نے مسافت طے کرائی، دوسرا واقعہ معراج کا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بیت المقدس سے تمام آسمانوں کی سیر کرائی گئی، یہ واقعہ سورۂ والنجم میں ہے۔ اور چونکہ ان دونوں واقعات کا زمانہ (وقت) ایک ہی ہے اس لیے دونوں کو ایک ساتھ بولا جاتا ہے۔ حضرت بوصیریؒ بھی پہلے شعر میں "اسراء" کا ذکر فرماتے ہیں اور دوسرے شعر میں معراج کا، ان دونوں کی تفصیل صحیح احادیث سے معلوم ہوتی ہے جس کو سیرتِ نبویہ کی کسی کتاب میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

وَقَدَّمَتْكَ جَمِيعُ الْأَنْبِيَاءِ بِهَا — وَالرُّسْلِ تَقْدِيمَ مَخْدُومٍ عَلَى خَدَمِ

وَأَنْتَ تَخْتَرِقُ السَّبْعَ الطِّبَاقَ بِهِمْ — فِي مَوْكَبٍ كُنْتَ فِيهِ صَاحِبَ الْعَلَمِ

(آپؐ کو تمام انبیائے کرام نے اس مقام پر آگے بڑھایا جس طرح ایک برگزیدہ مخدوم

شخصیت کو خادموں کے آگے رکھا جاتا ہے۔)

(آپؐ ان انبیائے کرام کے جلو میں سات آسمانوں کی تہیں (تہ کی جمع۔ مراد منزلیں) چاک کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے، اور انبیائے کرام کا ایک جلوس تھا جن کے درمیان عَلَم والے (جھنڈا لیے ہوئے) آپؐ ہی تھے۔)

احادیث نبویہؐ میں جو تفصیلات ہیں ان کی روسے آپؐ نے بیت المقدس میں تمام انبیائے کرامؑ کی امامت کی اور ایک آسمان تک تشریف لے گئے۔ انبیائے کرام اور فرشتوں کے جھرمٹ میں ان سب کے قائد تھے جن کے ہاتھوں میں رہبری کا علم تھا۔

شب معراج عروجِ تو گزشت از افلاک
بہ مقامے کہ رسیدی نہ رسد، ہیچ نبیؐ

(قدسی)

حَتّٰی إِذَا لَمْ تَدَعْ شَأْوًا لِمُسْتَبِقٍ ۔۔۔ مِنَ الدُّنُوِّ وَلَا مَرْقًى لِمُسْتَنِمِ

(یہاں تک آپؐ نے کسی مقابل کے لیے ایک قدم بڑھنے کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ وہ مقامِ (قربت الٰہی) کی طرف دوڑنے میں آگے نکل سکے، اور نہ کسی بلندی (چوٹی) پر چڑھنے والے کے لیے کوئی زینہ چھوڑا۔)

[عربی داں حضرات کے لیے: إذ ظرف زمان محض ہے حرف شرط نہیں ہے۔]

یعنی حق تعالیٰ جل شانہٗ کے مقام قربت تک پہنچنے کے لیے جو لوگ بڑھے ان میں ہمارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب پر فائق رہے، ترقی کا کوئی زینہ دوسرے کے لیے نہیں چھوڑا اور نہ قدم بڑھانے کی گنجائش چھوڑی۔

چونکہ اس شعر سے دوسرے انبیائے کرام کی بظاہر تنقیص ہوتی ہے، اس لیے اس کے بعد کے اشعار میں اس کو سنبھالا ہے۔

خَفَضْتَ كُلَّ مَقَامٍ بِالْإِضَافَةِ إِذْ ۔۔۔ نُوْدِيْتَ بِالرَّفْعِ مِثْلَ الْمُفْرَدِ الْعَلَمِ
كَيْمَا تَفُوْزَ بِوَصْلٍ أَيِّ مُسْتَتِرٍ ۔۔۔ عَنِ الْعُيُوْنِ وَسِرٍّ أَيِّ مُكْتَتِمِ

(اضافی لحاظ سے آپؐ نے ہر ایک صاحبِ مقام کے مرتبہ کو نیچا دکھا دیا۔ جب کہ آپ

پکارے گئے ایک یکتائے روزگار اور نمایاں ترین شخصیت کے مالک کی حیثیت سے۔

تاکہ آپؐ اس وصل سے شادماں ہوں جس کی حقیقت ہر نگاہ سے پوشیدہ ہے۔ اور وہ راز ہے جو پوری طرح محفوظ ہے۔)

گزشتہ چند اشعار میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی مدح بیان کی گئی تھی جس سے شبہ ہو سکتا تھا کہ دوسرے انبیائے کرام کی تنقیص ہو رہی ہے، جب کہ ثابت شدہ عقیدۂ اسلام یہ ہے کہ سب اللہ کے رسول باکمال، معصوم اور اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اور برگزیدہ پیغمبر تھے۔ پھر یہ کہنا کہ آپؐ کی حیثیت مخدوم کی تھی اور دوسرے انبیاء کی حیثیت خدام کی تھی، اور آپؐ نے اپنے ہمسروں کے مقابلہ میں وہ درجہ حاصل کیا جس کو پانے کا حوصلہ بھی دوسرے نہیں کر سکتے تھے، ترقی و عروج کا کوئی زینہ باقی ہی نہیں رہ گیا جس پر کوئی چڑھنے کی کوشش کرتا۔

اس شعر میں اس مفہوم کو واضح کیا ہے کہ جو بلندی اور برگزیدگی دکھائی گئی ہے وہ آپؐ کی حیثیت کے مطابق ہے۔ بالاضافۃ کا مطلب ہے کہ دوسرے انبیائے کرام کی صف جو کاملین کی صف ہے اس میں آپ کا درجہ اکمل و اشرف ہے، یوں تمام انبیائے کرام باکمال تھے۔

کَیْمَا مرکب ہے کَیْ (تاکہ) اور مَا زائدہ سے۔ اس کا ترجمہ صرف "تاکہ" ہی کیا جائے گا۔ مفرد: یکتا و یگانہ، ہر شخص میں ممتاز نظر آنے والا۔ العَلَم جھنڈے کو کہتے ہیں اور جھنڈا ہر ایک کو دور سے بھی نظر آتا ہے، اس لیے شخصیت رسولِ اکرمؐ کو العَلَم سے تشبیہ دی گئی کیونکہ آپؐ سب میں نمایاں تھے۔

فَحُزْتَ كُلَّ فَخَارٍ غَيْرَ مُشْتَرَكٍ ۔۔۔ وَجُزْتَ كُلَّ مَقَامٍ غَيْرَ مُزْدَحِمِ
وَجَلَّ مِقْدَارُ مَا وُلِّيْتَ مِنْ رُتَبٍ ۔۔۔ وَعَزَّ إِدْرَاكُ مَا أُوْلِيْتَ مِنْ نِعَمِ

اس سے پہلے یہ مضمون تھا کہ آپؐ اپنے فضل و کمال میں اس بلند مرتبہ پر فائز ہیں جہاں پہنچنے کی کسی کے لیے گنجائش ہی نہیں ہے، اس مضمون کو مزید وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

(لہٰذا آپ نے تمام باعث فخر کمالات کو اپنی ذات میں اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ ان میں آپؐ کا کوئی ہمسر نہیں ہے، اور آپ بلا شرکت غیرے ان کے حقدار ہیں۔ اور ترقی و عروج کی ہر منزل کو آپؐ نے طے کر لیا اس طرح کہ آپ کے راستے میں کوئی مزاحم نہ ہو سکا۔)

(جن درجات عالیہ تک آپ کی رسائی ہوئی ہے، وہ بہت اعلیٰ وارفع ہیں، اور آپ جن انعامات سے سرفراز کیے گئے ان کی عظمت کا ادراک کرنا بھی مشکل ہے۔)

فخار: کارنامے یا قابلِ عظمت باتیں جن پر کوئی فخر کر سکے، مَقام سے مراد درجات عالیہ ہیں۔
وُلِّیَ: مالک بنائے گئے۔ اُولِیَ: سرفراز کیے گئے۔

بُشْرٰى لَنَا مَعْشَرَ الْإِسْلَامِ أَنَّ لَنَا ... مِنَ الْعِنَايَةِ رُكْنًا غَيْرَ مُنْهَدِمِ
لَمَّا دَعَا اللّٰهُ دَاعِيْنَا لِطَاعَتِهِ ... بِأَكْرَمِ الرُّسُلِ كُنَّا أَكْرَمَ الْأُمَمِ

(ہم مسلمانوں کی یہ انتہائی خوش بختی ہے کہ حق تعالیٰ کی عنایات نے ہمیں ایک ایسا ستون دیا ہے جو کبھی منہدم نہیں ہو سکتا۔)

رُکنٌ دراصل پایہ یا ستون کو کہتے ہیں جس پر عمارت قائم رہتی ہے، اور جس سے انسان کمزوری کے وقت سہارا لیتا ہے۔

ایک مسنون دعا میں اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے بندہ عرض کرتا ہے یا رُکنَ مَنْ لَا رُکْنَ لَہٗ یعنی اے وہ ذات جو بے سہاروں کا سہارا ہے۔

اس شعر میں رُکن سے مراد شریعت اسلامیہ ہے، اور ناقابلِ شکست یا ناقابلِ انہدام سے مطلب غیر منسوخ ہے یعنی ایسی شریعت جو ہر طرح سے مضبوط و مستحکم اور دیگر آسمانی مذاہب کی طرح منسوخ ہونے والی نہیں ہے۔ شاعر حضرت بوصیریؒ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے خاص عنایات سے روزِ ازل ہی سے ایسی شریعت مقدر فرما دی جو کبھی منسوخ ہو کر ختم ہونے والی نہیں ہے۔ بُشریٰ کا عام طور پر ترجمہ خوش خبری کیا جاتا ہے اور صحیح ہے۔ لیکن استعمالات سے پتہ چلتا ہے کہ ہر قابلِ شکر بات، کوئی کھوئی ہوئی چیز مل جائے یا اچانک کوئی چیز مل جائے اس موقع پر بھی بُشریٰ بولا کرتے ہیں مولانا فتح محمد خاں جالندھریؒ نے اس لفظ کا ترجمہ "زہے قسمت" کیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جب ان کو اندھے کنویں میں پھینک آئے اور مصر کے ایک تجارتی قافلہ نے پانی کی جستجو میں اس کنویں میں ڈول ڈالا اور اس سے حضرت یوسف علیہ السلام لٹک گئے تو ڈول ڈالنے والا بے ساختہ بولا:

يَا بُشْرٰى هٰذَا غُلَامٌ (زہے قسمت یہ تو نہایت حسین لڑکا ہے۔)

دوسرے شعر کا ترجمہ یہ ہے:

(جب اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء میں قابلِ عظمت نبی قرار دیا کہ وہ ہم سب کو اپنی اطاعت کی دعوت دیں تو ہم بھی تمام امتوں میں قابلِ عظمت قوم بن گئے۔)

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اَکْرَمُ الرُّسُل (تمام پیغمبروں میں اشرف ترین) بنا کر اللہ نے بھیجا تو جس امت کی طرف بھیجا یا جس نے آپ کی دعوت قبول کی وہ بھی اَکْرَمُ الْأُمَم (تمام امتوں میں اشرف ترین امت) بن گئی۔

پہلے شعر میں بُشْرٰى لَنَا "زہے قسمت ہماری" جو کہا ہے اس کو دوسرے شعر میں واضح کیا:

رَاعَتْ قُلُوبَ الْعِدَا أَنْبَاءُ بِعْثَتِهِ ... كَنَبْأَةٍ أَجْفَلَتْ غُفْلًا مِنَ الْغَنَمِ
مَا زَالَ يَلْقَاهُمْ فِي كُلِّ مُعْتَرَكٍ ... حَتّٰى حَكَوْا بِالْقَنَا لَحْمًا عَلٰى وَضَمِ

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر نے دشمنوں کے دل میں اس درجہ دہشت ڈال دی جیسے شیر کی ایک گرج سے بکریوں اور بھیڑوں کی بے پرواہ (وبے فکر ٹولی) میں بھگدڑ مچ جائے۔)

(آپ ان دشمنوں سے ہر جنگ میں برسرپیکار رہے، یہاں تک کہ تیروں اور نیزوں کے حملوں سے وہ اس گوشت کے ٹکڑوں کے مثل ہو گئے جس کو قصاب نے (اپنے خاص قسم کی) لکڑی پر کوٹنے کاٹنے کو رکھا ہو۔)

حاصلِ کلام یہ ہے کہ:

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

آوازۂ رسالت سے دشمنوں کے دل کانپ اٹھے، اور وہ بھیڑ بکری کے ریوڑوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے جو شیر کی گرج سنتے ہی دہشت سے کانپنے لگتے ہیں، اور حضور اکرمؐ دشمنوں سے چھپ کر نہیں رہے بلکہ تقریباً ہر غزوہ میں آپ کا سامنا ہوتا رہا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دشمن گوشت کے اس بڑے ٹکڑے کی طرح ہو گئے جن کو قصاب اپنی مڈھی یا ٹھیہ پر رکھ کر قیمہ بناتا یا کاٹتا اور بوٹیاں بناتا ہے۔ بعض لوگ

کندی یا ٹھیہہ یا منڈھی کہتے ہیں۔ یعنی مقابلہ کی تاب نہ لا سکے اور سپر انداز ہو گئے۔

مطلب صرف یہ ہے کہ ہر معرکۂ حق و باطل میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیاب کیا۔

وَدُّوا الفِرارَ فَکادُوا یَغبِطُونَ بِہٖ　　أَشلاءَ شالَتْ مَعَ العِقْبانِ والرَّخَمِ
تَمضِی اللَّیالِی ولا یَدرُونَ عِدَّتَہا　　مالَمْ تَکُنْ مِن لَیالِی الأَشہُرِ الحُرُمِ

(دشمنان اسلام) چاہتے تھے کہ بھاگ کھڑے ہوں، بلکہ بھاگنے (کی صلاحیت پر) رشک کرنے کے قریب تھے، کاش وہ اس طرح اڑ سکتے جیسے گوشت کے ٹکڑے کو لے کر کوئی عقاب یا گدھ اڑ جائے۔)

(راتیں گزرتی ہیں اور وہ (مارے دہشت کے) ہوش نہیں رکھتے کہ کب اور کون سی تاریخ آئی، جب تک حرمت والے مہینے نہ آجاتے (ان کی دہشت کم نہ ہوتی۔)

ان دونوں شعروں میں شیخ بوصیریؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح و نصرت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اس لیے دشمنان اسلام اگرچہ عرب کے بہادر اور جاں باز اور جنگ کو کھیل سمجھنے والے لوگ تھے اور موت سے ڈرنے والے لوگ نہ تھے، اور جنگ میں پیٹھ دکھانا یا معرکہ سے فرار اختیار کرنا ان کے معاشرہ میں بڑے عیب کی بات تھی مگر اس کے باوجود اسلام کی دہشت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رعب ان پر اتنا چھایا ہوا تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ اسلامی فوج سے کبھی مڈبھیڑ کی نوبت نہ آنے پائے، اور جس طرح اردو میں بولتے ہیں کہ مصیبت سے تنگ آکر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کاش زمین پھٹ جاتی اور ہم اس میں سما جاتے، یہی حال کفار قریش کا ہو گیا کہ وہ تمنا کرنے لگے کہ کاش ان عقابوں اور گدھوں کے مانند ہوتے جو گوشت کا ٹکڑا لے کر اڑ جاتے ہیں اور دہشت کا مزید یہ عالم تھا کہ دن اور تاریخ بھی بھول گئے تھے، ان کو یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون سی رات ہے اور کل کون سا دن ہے، البتہ جب حرمت والے مہینے آتے (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب) تو پھر ان کو ہوش آتا اور سمجھ میں آتا کہ آج کون سی تاریخ ہے کیونکہ ان مہینوں میں ان کو اطمینان رہتا کہ اس میں جنگ نہ ہو گی۔ خلاصہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رعب سے عرب کے بہادر سورما حد درجہ کمزور اور بزدل ہو گئے تھے۔

کَأَنَّما الدِّینُ ضَیفٌ حَلَّ ساحَتَہُمْ　　بِکُلِّ قَرْمٍ إِلیٰ لَحمِ العِدا قَرِمِ

(گویا کہ اسلام ایک مہمان ہے جو ان کے ایوان میں داخل ہوا ہے تمام بہادروں کے ساتھ جو دشمنوں کے گوشت کھانے کا خواہشمند ہے[1]۔)

باجوریؒ نے اپنی شرح میں لکھا ہے کہ 'ساحتہم' میں ضمیر صحابۂ کرام کی طرف راجع ہے۔ یہی اکثر علماء کا خیال ہے کیونکہ وہی ایمان لائے اور ایمان ان کے قلوب میں جاگزیں ہوا جس کو مجازاً صحن خانہ یا ایوان کہا گیا۔ اور 'بکل قرم' میں ب معیت کا ہے، جس کا مطلب ہوا کہ تمام بہادروں کے ساتھ جو دشمن کا خون پینے کے لیے بے چین تھے۔ بعض شارحین کا خیال ہے کہ ساحتہم میں ھُمْ کی خبر کفار کی طرف راجع ہے کیونکہ وہ امتِ دعوت تھے، اور اسلام ان کے وطن میں پہلی بار پیش کیا گیا مگر وہ مسلمانوں کے خلاف اپنے تمام بہادروں کے ساتھ سازش کر رہے تھے اور مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے، شارح باجوریؒ نے پہلے ہی معنیٰ کو ترجیح دی ہے، اور یہی زیادہ واضح مفہوم ہے کہ اسلام ان کی بستی میں ایک مہمان کی حیثیت سے داخل ہوا اور اس کی حفاظت کے لیے وہ اپنے تمام جواں مردوں کے ساتھ تیار ہو گئے، اور جواں مرد بھی ایسے جو دشمن کے خون کے پیاسے تھے۔ یہاں بھی وہ عرب مزاج پیش نظر رکھا جائے جو 'جار' کی تشریح میں پہلے لکھا جا چکا ہے کہ عرب اپنے مہمان کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ جوش کے ساتھ کرتے تھے اسی لیے جو ان کے پڑوس میں آجاتا وہ اپنے آپ کو محفوظ پاتا۔

بہ زحمت ہائے صد سیلِ رواں از جاں می جنبد
خسِ کو تکیہ بر بازوئے سنگ آستانت کرد

(مولانا تمنا عمادی)

(یعنی سیکڑوں سیلاب کی رو بھی اس تنکے کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی۔ جس تنکے کو آپؐ

---

[1] قرم درمیانی حرف 'ر' کو جزم ہے تو بہادر کے معنی ہیں اور اگر کسرہ ہے تو کسی کھانے کی شدید طلب پر دلالت کرتا ہے، عام طور پر گوشت خوری کی طلب کے لیے فعل آتا ہے، جیسے پیاسے کے لیے عطش، بھوکے کے لیے جائع، اسی طرح گوشت کے طالب کے لیے قرم، مگر علامہ زمخشری نے اساس البلاغہ میں مطلق خواہش کو قرم لکھا ہے۔

کے آستانے کے در پر ٹھکانہ مل گیا ہے۔)

يَجُرُّ بَحْرَ خَمِيسٍ فَوْقَ سَابِحَةٍ ۔۔۔ يَرْمِي بِمَوْجٍ مِنَ الْأَبْطَالِ مُلْتَطِمِ
مِنْ كُلِّ مُنْتَدِبٍ، لِلّٰهِ مُحْتَسِبٍ ۔۔۔ يَسْطُو بِمُسْتَأْصِلٍ لِلْكُفْرِ مُصْطَلِمِ

(یہ مہمان اپنے ساتھ شہسواروں کا ایک سمندر کھینچ کر لاتا ہے جس کے سورماؤں کی موج ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہے۔)

(ان میں سے ہر فوجی اللہ کا داعی اس سے اجر کا طالب، حملہ دار، کفر کو نیست و نابود کرنے والا اور اس کی جڑ کاٹنے والا ہے۔)

ان دونوں شعروں میں متعدد تشبیہات اور استعارے ہیں، پہلے تو اسلام کو سرزمین عرب میں صحابہؓ کے گھروں کا مہمان بتایا، جیساکہ اس سے پہلے والے شعر میں گزرا، اب اسی مہمان یعنی اسلام کی قوت کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اپنے ساتھ ایک فوج ظفر موج لے کر بڑھتا ہے خمیس جنگی دستہ کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں پانچ رکن ہوتے ہیں، ایک آگے چلنے والا دستہ، پھر میمنہ دائیں طرف، میسرہ بائیں طرف اور درمیان میں ساقہ یا قلب (فرنٹ) پر لڑنے والا دستہ، سابحہ پیرنے والے کو کہتے ہیں اور یہ استعارہ ہے گھوڑوں سے جو اس درجہ سبک روئی سے چلتے ہیں جیسے کوئی پانی میں پیر رہا ہو، مراد گھوڑے نہیں گھوڑ سواری۔ اور جب 'سابحۃ' کہا تو اس کے لیے یعنی شہسواروں کو موج سے تشبیہ دی۔ ملتطم کے معنی ہیں موج کا ابھر کر دوسری موج پر چڑھنا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام اپنے ساتھ اپنے بہادروں (ابطال) کی فوج لے کر بڑھا، جس کے شہسوار پانی کی موج کی طرح ابھرتے ہوئے اور امڈتے ہوئے نظر آئے۔

دوسرے شعر میں یہ کہاکہ یہ فوج جن سپاہیوں سے ترتیب دی گئی ہے ان میں سے ہر شخص اپنی ذات یا حکومت حاصل کرنے کے لیے یا دوسرے انسانوں کو غلام بنانے کے لیے نہیں بلکہ اللہ کا بلایا ہوا، اس کے اجر و ثواب اور آخرت کے اجر کا طالب بن کر آیا ہے، وہ اپنی جوانمردی سے کفر کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے جان دینے پر تلا ہوا ہے

حَتّٰى غَدَتْ مِلَّةُ الْإِسْلَامِ وَهِيَ بِهِمْ ۔۔۔ مِنْ بَعْدِ غُرْبَتِهَا مَوْصُولَةَ الرَّحِمِ
مَكْفُولَةً أَبَدًا مِنْهُمْ بِخَيْرِ أَبٍ ۔۔۔ وَخَيْرِ بَعْلٍ فَلَمْ تَيْتَمْ وَلَمْ تَئِمِ

(یہاں تک کہ اسلامی ملت، ان صحابۂ کرام کے آپس میں اتحاد کی بنا پر ایک خاندان کی طرح بن گئی جس کے افراد ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، اور یہ خاندان بھی ہمیشہ کے لیے ایک سرپرست خاندان بہترین باپ و بہترین شوہر کی حمایت میں محفوظ و مامون بن گیا جس کو تیمی یا بیوگی سے سابقہ نہیں پڑا۔)

جیساکہ الفاظ سے ظاہر ہے یہ سب استعارے ہیں۔ شاعر نے اسلام کے اس معاشرہ کو جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے وجود میں آیا تھا ایک پختہ، مستحکم قلعہ سے تشبیہ دی، پھر اس کے افراد کو ایک خاندان سے تشبیہ دی کہ اس کے افراد آپس میں رشتہ دار ہیں، اور سب کو پاس صلۂ رحم ہے، اور اس خاندان کے سرپرست (باپ، شوہر) خود حضور انورؐ ہیں اس لیے اس خاندان اسلام کو کبھی یتیمی یا بیوگی کا غم نہیں اٹھانا پڑا۔

عربی داں حضرات کے لیے یہ اشارہ کافی ہوگا کہ غدت کی خبر موصولۃ الرحم۔ "وھی بھم من بعد غربتھا" جملہ معترضہ ہے، یعنی ایک زمانہ تھا جب کہ اسلام مسافرانہ بیکسی میں تھا جیساکہ صحیح مسلم کی حدیث ہے اسلام مسافرانہ بیکسی میں شروع ہوا اور اس طرح ایک زمانہ آئے گا کہ وہ مسافرانہ کس مپرسی ہی میں واپس آجائے گا، الخ۔ مکفولۃ خبر ہے، مبتدا محذوف ملۃ الإسلام ہے۔ فلم تیتم یُتْم سے اور لم تئم۔ أَيِّم (بیوہ) سے۔

هُمُ الْجِبَالُ فَسَلْ عَنْهُمْ مُصَادِمَهُمْ ۔۔۔ مَاذَا رَأَى مِنْهُمْ فِي كُلِّ مُصْطَدَمِ
وَسَلْ حُنَيْنًا، وَسَلْ بَدْرًا، وَسَلْ أُحُدًا ۔۔۔ فُصُولَ حَتْفٍ لَهُمْ أَدْهٰى مِنَ الْوَخَمِ

(یہ جاں نثاروں کی جماعت ایک پہاڑ تھی، ان سے ٹکر لینے والوں سے پوچھو کہ انھوں نے جنگ پر ان کو کیسا پایا۔ حنین سے پوچھو، بدر سے دریافت کرو، احد سے معلوم کرو، ان کی ہلاکت کا زمانہ وبا کے زمانہ سے کہیں زیادہ مصیبت لانے والا تھا۔)

ان دونوں شعروں میں صحابۂ کرام کی شجاعت، جوانمردی اور ہمت کا ذکر ہے۔ حنین سے پوچھو، بدر سے پوچھو، احد سے پوچھو کا مطلب واضح ہے۔ اہل حنین سے پوچھو، یا ان معرکوں کی تاریخیں لکھنے والوں سے دریافت کرو۔ ایک شاعرانہ انداز بیان ہے۔

وخم: وبا کو کہتے ہیں۔ ادھٰی: زیادہ ہلاکت آفریں۔ فصول: زمانے۔ حتف:

ہلاکت۔ یہاں مراد جنگ ہے یعنی زمانۂ جنگ جن کفار کو صحابۂ کرام سے سابقہ پڑا۔ وہ ان کفار کو دنیا سے سخت ہلاکت آفریں ثابت ہوئے۔

المُصْدِرِی البِیْضِ حُمْرًا بَعْدَ مَا وَرَدَتْ مِنَ العِدَا کُلَّ مُسْوَدٍّ مِنَ اللِّمَمِ
والکَاتِبِیْنَ بِسُمْرِ الخَطِّ مَا تَرَکَتْ اَقْلَامُهُم حَرْفَ جِسْمٍ غَیْرَ مُنْعَجِمِ

(وہ جاں باز جنھوں نے اپنی چمکتی ہوئی تلواروں کو دشمنوں پر آزمانے کے بعد واپس لی تو ان کی (دھاریں) خون دشمن سے سُرخ تھیں۔ جس سے انھوں نے سیاہ بالوں (یعنی سروں) پر وار کیا تھا۔)

(وہ جن کے قلم نے سیاہ نیزوں پر وہ تحریر لکھی جس نے کسی جسم حرف کو بے نقطہ نہیں چھوڑا۔)

ان شعروں میں سب ہی الفاظ استعارے کنائے کے ہیں۔ المُصدر واپس لینے والا، جمع المصدرین نون اضافت کی وجہ سے حذف ہوئی۔ البیض: چمکتی ہوئی لوہے کی تلواریں۔ مود: سیاہ۔ لَمَم لُمّة کی جمع بالوں کی لٹیں۔ سُمُر أسمر کی جمع۔ الخط نیزہ۔ منعجم: نقطہ ڈالے ہوئے حروف۔

صحابۂ کرام جنھوں نے اسلام کے دفاع میں تلواریں اٹھائیں تو جب وہ اپنا وار سروں کی سیاہ کھوپڑیوں پر کرتے تھے تو حالانکہ ان کے نیزے سیاہ ہوتے مگر جب ان کو واپسی میں میان میں رکھتے تو ان پر خون کی سُرخی ہوتی تھی، اور وہ انہی نیلگوں نیزوں سے جو تحریر ثبت کرتے تو جسم کا کوئی حصہ گھائل کیے بغیر نہ چھوڑتے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام کو مہمان بنانے والے تلوار کے دھنی اور بہادر لوگ تھے۔

شَاکِی السِّلَاحِ، لَهُمْ سِیْمَا تُمَیِّزُهُمْ وَالْوَرْدُ یُمْتَازُ بِالسِّیْمَا مِنَ السَّلَمِ
تُهْدِیْ اِلَیْکَ رِیَاحُ النَّصْرِ نَشْرَهُمُ فَتَحْسَبُ الزَّهْرَ فِی الْاَکْمَامِ کُلَّ کَمِی

اوپر سے صحابۂ کرامؓ کی شجاعت وجاں بازی کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ حق کی سربلندی کے لیے میدانِ کارزار میں اپنی قوت اور بہادری کا لوہا منوا چکے ہیں، انھیں کے ذکر میں شاعر حضرت بوصیریؒ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ:

(بڑے تیز ہتھیار کے مالک ہیں، ان کی ایک خاص پہچان بھی ہے جو ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے، جیسے گلاب کی ایک پہچان ہے (خوشبو، رنگت، بناوٹ) جو اس کو 'سَلَم' نامی پھول سے ممتاز کرتی ہے، اسی طرح ان حضرات کی ایک پہچان ہے کہ نسیم فتحمندی ان کی خوشبوؤں کی لپٹ تم کو پہنچاتی ہے (ہدیہ کرتی ہے) تم کو محسوس ہوتا ہے کہ کلیوں کے ناشگفتہ پھول کی طرح ہر سپاہی ہے جو خود وزرہ سے آراستہ ہے۔)

شاکی: تیز، جس کی کاٹ سخت ہو، سلاح: ہتھیار، شاکی السلاح، صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے، جیسے پہلے اوپر کے شعر میں آچکا ہے۔ "مُصْدِرِی البِیضِ" نون جمع بہ سبب اضافت حذف کر دیا گیا ہے۔ سیما: علامت یا پہچان کے معنوں میں قرآن کریم میں وارد ہے: "سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ" (ان کی پہچان ان کے چہروں پر سجدوں کا نشان ہے، سَلَم: ایک پھول ہے جس کے گرد کانٹے ہوتے ہیں۔ اور گلاب میں بھی یہ صفت ہے مگر گلاب اپنی خوشبو، رنگت اور خوبصورتی کی وجہ سے ممتاز ہے، اہل لغت کا کہنا ہے کہ سَلَم کا مؤنث سَلَمی ہے جو نسوانی نام ہوا کرتا ہے۔ نشر: خوشبوؤں کی لپٹ کو کہتے ہیں، ریاح النصر: فتح مندی کی ہوا۔ اسی خوشبو کو پھیلا رہی ہے، اسی لیے بجائے ہوا کے 'نسیم فتح مندی' ترجمہ کیا گیا۔ کمی: اس فوجی کو کہتے ہیں جو خود وزرہ پہنے ہوئے ہو۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ فوجی جو خود وزرہ پہنے ہوئے ہے ایسا لگتا ہے جیسے ناشگفتہ کلی ہو، کلیاں پھول سے زیادہ حسین ہوتی ہیں اور زرہ میں چھپا ہوا آدمی ایک کلی کی طرح ہے، مگر یہ نہیں کہا کہ سپاہی کلی کی طرح ہے بلکہ تشبیہ مقلوب اختیار کی کہ کلیاں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے زرہ پوش سپاہی۔

ان دونوں شعروں میں شاعر کا رُخ مدح نبی کے اس پہلو کی طرف ہے کہ نہ صرف آپؐ کی ذاتِ گرامی مصدر محبت ہے بلکہ آپؐ سے نسبت رکھنے والی ہر شئے، آپ سے تعلق رکھنے والا ہر فرد گل وگلاب سے زیادہ حسین، وہ خود وزرہ میں بھی ایک غنچہ کی طرح خوشبو دینے والا اور دل آویز ہے۔

کَاَنَّهُمْ فِیْ ظُهُوْرِ الْخَیْلِ نَبْتُ رُبًا مِنْ شِدَّةِ الْحَزْمِ، لَا مِنْ شِدَّةِ الْحُزُمِ

(صحابۂ کرامؓ گھوڑوں کی پشت پر جس وقت سوار ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی بلند مقام پر اگا ہوا درخت ہے۔ وہ اپنی پامردی، استقلال، عقل وفہم، دیدہ وری

امورِ جنگ میں مہارت رکھنے کی وجہ سے ایسے لگتے ہیں، نہ کہ اس لیے کہ انھوں نے اپنے آپ کو زین و بکتر سے سختی سے باندھ رکھا ہے۔)

اس شعر میں صحابہ کرامؓ کو ان درختوں سے تشبیہ دی ہے جو کسی بلند ٹیلہ یا عام سطح سے بلند مقام پر اُگے ہوئے ہوں، جو دشمنوں پر حملہ کرنے کے لیے دائیں بائیں، آگے پیچھے مڑتے ہیں، جیسے ہوا کے جھونکوں سے درخت کی شاخیں دائیں بائیں ہوتی ہیں مگر اپنی جگہ سے ٹلتی نہیں ہیں، ان بلندی کے درختوں کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں، اور یہ درخت عام سطح پر نمودار ہونے والے درختوں سے زیادہ پائیدار اور مضبوط ہوتے ہیں۔

رُبا، رَبْوہ کی جمع ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں آیا ہے اور لغت کی رو سے اس کے پہلے حرف (ر) کو تینوں شکلوں (رَبْوَہ، رِبْوَہ، رُبْوَہ) سے پڑھا جا سکتا ہے، اصطلاح میں اس کو مثلث کہتے ہیں۔

یہ پامردی اور مستقل مزاجی ان کی عقل اور حکمت کی دلیل ہے، اس لیے نہیں کہ وہ مضبوط زین میں کسے ہوئے گھوڑے پر بیٹھے ہیں۔ حَزْم: عقل و فراست کو کہتے ہیں اور حُزُم (حزام کی جمع) باندھنے کی رسی، اسی طرح شِدّۃ (سختی)، شَدّہ (باندھنا) اس کو صنائع و بدائع کی قسم میں صفت جناس کہا جاتا ہے۔

عربی داں حضرات کے لیے یہ اشارہ بھی ضروری ہے کہ اس شعر میں حرف جر (فی) فی ظهور الخیل میں (علی) کے معنی میں ہے، جیسے قرآن کریم میں (لَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ) علی جُذوع النخل کے معنی میں ہے، اور دوسرے مصرعہ میں (من) دونوں جگہ من شِدۃ الحزم/ من شَدۃ الحزم لام تعلیل کے معنوں میں ہے۔

طَارَتْ قُلُوبُ العِدَا مِنْ بَأْسِهِمْ فَرَقًا　　　فَمَا تَفَرَّقُ بَيْنَ البَهْمِ وَالبُهَمِ

(دشمنوں کے دل ان صحابہ کرام کی ہیبت و شجاعت کی وجہ سے دہل اٹھے، یہاں تک کہ ان کو یہ ہوش بھی نہ رہا کہ بھیڑ بکریوں کے بچوں اور جاں باز بہادروں میں کیا فرق ہے۔)

عربی محاورہ کے لحاظ سے "دل کا اڑنا" اسی موقع پر بولتے ہیں جس موقع پر اردو میں دل دہلنا بولا جاتا ہے۔ فَرَق: خوف و دہشت کو کہتے ہیں۔ بَهْم: بھیڑ، بکریوں کے بچے، اس کا مفرد

بھیمۃ ہے۔ قرآن میں بهيمة الانعام آیا ہے یعنی چوپایوں کے کمسن بچے، اور بهمة بہادر کو کہتے ہیں اس کی جمع بُهَم ہے۔

اس شعر میں صنائع بدائع کی قسم صفت جناس کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر حضرت بوصیریؒ کو الفاظ پر کتنی قدرت حاصل تھی۔

وَمَنْ تَكُنْ بِرَسُولِ اللّٰهِ نُصْرَتُهُ　　　إِنْ تَلْقَهُ الأُسْدُ فِي آجَامِهَا تَجِمِ

(اور جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مدد ملی ہو، اس سے اگر شیر بھی اپنے کچھاروں میں مل جائیں تو ٹھنڈے پڑ جائیں۔)

یعنی جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور سنت کی پیروی کی نعمت حاصل ہو اور جس کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت مشعل راہ ہو اس کو کون زیر کر سکتا ہے، شیر اپنے بھٹ (یا کچھار) میں بڑے جری ہوتے ہیں مگر وہ بھی ان لوگوں کا سامنا کریں تو بے حس و حرکت ہو جائیں گے۔

أَسَد (شیر) کی جمع أُسُد اور أُسْد دونوں آتی ہے، آجام أجمة کی جمع ہے، جنگل میں شیر کا بھٹ یا کچھار، اردو میں أجمة کو کچھار کہتے ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے

تَجِمُ کا مصدر وُجُوم ہے، بے حس و حرکت ہو جانا کہ آواز نکالنے کی ہمت نہ ہو، مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی وجہ سے ان کو اللہ تعالیٰ کی مدد ملی، اور جس کی مدد کا واسطہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہو، اس کی ہیبت کا کیا ٹھکانہ؟

"خوش عقیدہ" (من تكون برسول الله نُصْرَتُهُ) کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ جس کا سہارا، آسرا اور مدد کا سرچشمہ رسول اللہؐ ہیں ان سے شیر نیستاں بھی ملیں تو بے حس و حرکت ہو جائیں لیکن پہلا مفہوم صحیح ہے اور الباجوری نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ نبہانی وغیرہ نے دوسرا مطلب لیا ہے۔

وَلَنْ تَرَىٰ مِنْ وَلِيٍّ غَيْرَ مُنْتَصِرٍ　　　بِهِ، وَلَا مِنْ عَدُوٍّ غَيْرَ مُنْقَصِمِ

(تم کبھی کسی ولی کو جو آپ سے وابستہ ہو غیر فتحیاب نہیں دیکھو گے اور نہ کسی ایسے دشمن کو دیکھو گے جو شکست خوردہ نہ ہو۔)

الباجوریؒ شارح قصیدہ بردہ کہتے ہیں کہ دیکھنے کا مطلب آنکھوں سے دیکھنا مراد ہے اور

دیکھنے کا مطلب عملی بھی ہو سکتا ہے۔ ولی دوست کو کہتے ہیں، یہاں مراد پابند سنت، احکام خداوندی کا اطاعت گزار بندہ ہے، ایسا شخص جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا سہارا لیا اور جنگ وصلح دونوں میں اس کا مقصود رضائے الٰہی رہا وہ اللہ کا ولی ہے وہ ہمیشہ فتحمند ہوگا اور اگر کسی جنگ میں بظاہر اس کو شکست بھی ہوئی تو نتیجہ کے اعتبار سے وہی کامیاب رہا اور مجموعی طور پر وہی فتحمند سمجھا گیا اور اس کا دشمن اگرچہ بعض مواقع پر فتحمند سمجھا گیا مگر انجام کار کے لحاظ سے رسوا و ناکام رہا، لہٰذا انتصار (فتحیابی) وہی انتصار ہے جو انجام کار کے لحاظ سے ہو۔

بعض نسخوں میں اس شعر کا آخری لفظ مُنْقَصِمْ کے بجائے مُنْفَصِمْ (ف سے) آیا ہے دونوں کے معنی ایک ہیں مگر ایک باریک فرق یہ ہے کہ قصم میں شکست ظاہری ہوتی ہے اور فصم (لڑی کا ٹوٹ جانا) میں شکست معنوی ہوتی ہے۔

أَحَلَّ أُمَّتَهُ فِي حِرْزِ مِلَّتِهِ كَاللَّيْثِ حَلَّ مَعَ الْأَشْبَالِ فِي أَجَمِ

(آپ نے اپنی قوم کو اپنے دین کے قلعہ میں اس طرح محفوظ رکھا ہے جیسے شیر نیستاں اپنے شیر بچوں کے ساتھ کچھاروں (یا بھٹوں میں) رہتا ہے۔)

اس شعر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت وہیبت، شان وعظمت کو شیر کے دبدبہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور اہل ایمان کو اشبال (جمع شبل) یعنی شیر بچوں سے، اور اسلامی عقائد کو شیر کے بھٹ (یا کچھار) سے تشبیہ دی ہے۔

یہ تشبیہات بھی درحقیقت 'تشبیہ مقلوب' کے ضمن میں آتی ہیں، اوپر اسی قصیدہ کے کسی شعر کے سلسلہ میں عرض کیا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کو چاند سے ہم تشبیہ نہیں دیتے بلکہ چاند کو تشبیہ دیتے ہیں کہ اس میں روئے انور کی جھلک پائی جاتی ہے، مولانا تمنا عمادیؒ کا شعر ہے:

رات بھر کیوں نہ تجھے چاند میں دیکھا ہی کروں
ان کی صورت سے بہت ملتی ہے صورت تیری

اسی طرح تشبیہ تو ممکن تھی کہ کہا جاتا کہ شیر کو جو قوت وہیبت، رعب ودبدبہ حاصل ہے اس میں کچھ آثار آپؐ کی ہیبت وعظمت کے ملتے ہیں مگر یہ بات بھی بنتی نہیں ہے کیونکہ انسان خود ہی اشرف المخلوقات ہے اور اشرف المخلوقات میں سب سے افضل آپؐ کی ذات گرامی ہے، اس لیے شیر کی حیثیت آپؐ کے

سامنے ایک مکھی کی رہ جاتی ہے۔ مگر انسان اس چیز سے تشبیہ دیتا ہے جو اس کے مشاہدہ میں ہے۔ آپ کی صحیح عظمت کا ادراک، اور آپ کے طفیل میں امت اسلامیہ کو جو مقام عند اللہ حاصل ہے اس کو بیان کرنا ممکن نہ تھا، اس لیے تشبیہات کا سہارا لیا مگر ہر تشبیہ تشنہ، اور صحیح راست آنے والی مثال کا حصول محال ہے۔ انیسؔ نے کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت وہیبت کو الفاظ میں بیان کریں، وہ محاکات کرتے ہیں سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی:

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں آئے غضب خدا کا ادھر، رُخ جدھر کروں
بے جبرئیل کار قضا و قدر کروں انگلی کے ایک اشارہ سے شق القمر کروں
طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

ان اشعار میں مبالغہ کی زبان سے کچھ عظمت وہیبت کا احساس ہوتا ہے مگر حضرت بوصیریؒ کے کلام میں جو نورانیت ہے ان میں مفقود ہے۔

كَمْ جَدَّلَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ مِنْ جَدِلٍ فِيهِ وَكَمْ خَصَمَ الْبُرْهَانُ مِنْ خَصِمِ

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آیات الٰہی (قرآن کریم) نے بہت سے کٹ حجتی کرنے والوں کو زیر کر دیا ہے۔ اور بہت سے معاندوں کو برہان ودلائل نے پسپا کر دیا ہے۔)

اوپر کے اشعار میں ذکر تھا صحابہ کرامؓ کے زور بازو کا، ان کی شجاعت وپامردی کا، اور اب یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ جب ٹھوس عقلی دلائل سے دین اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کی ضرورت ہوئی یا اگر کسی نے سنجیدہ علمی بحث ومناظرہ کے ذریعہ اسلام کی صداقت اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل طلب کی تو قرآن کریم کی آیات نے اس کا منھ توڑ جواب دیا۔

عربی میں الجدالة زمین کو کہتے ہیں۔ جدّل کے معنی ہیں کسی کو زمین پر پچھاڑ دینا، جَدِل اس شخص کو کہتے ہیں جو بحث ومناظرہ میں بہت تیز ہوتا ہے۔ خصم: (فعل ماضی) جھگڑا کرنے والے کو شکست دینا، خَصِمْ: جھگڑالو۔

معنی یہ ہوئے کہ آیاتِ قرآنی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اختلاف کرنے والوں کو بحث میں خاموش کر دیا اور بحث ومناظرہ کرنے والوں کو پسپا کر دیا۔

الباجوریؒ اپنی شرح میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو آزمانے کے لیے یہودی علماء بعض اہلِ قریش کو سوالات سکھا کر بھیجا کرتے تھے کہ وہ آپ سے دریافت کریں، اور کہا کرتے تھے کہ اگر سب جواب پورا پورا دے دیں تو ان کی نبوت کا دعویٰ غلط ہوگا کیونکہ اس سے پتہ چلے گا کہ کسی نے ان کو سوال جواب سب بتادیا ہے، اور اگر کسی بھی سوال کا جواب نہ دے سکیں تو یہ کھلی دلیل ہوگی کہ ان کو اللہ کی طرف سے کوئی علم نہیں دیا گیا، ہاں اگر بعض باتوں کا صحیح جواب دیں اور بعض کے بارے میں یہ کہیں کہ اللہ کو معلوم ہے یا اللہ جانتا ہے تو بے شک یہ نبی کی شان ہے، چنانچہ لوگوں نے آگر روح کے بارے میں، اصحاب کہف کے بارے میں، ذوالقرنین کے بارے میں آپ سے دریافت کیا، اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق قرآن نے تفصیل سے بتادیا، مگر روح کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" (کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کا ایک امر ہے۔) گویا اس کی حقیقت ماہیت طبی و مادی نقطۂ نظر سے نہیں بتائی۔ صرف یہ کہہ دیا کہ اللہ کا یہ حکم ہے۔

کَفَاکَ بِالْعِلْمِ فِی الْاُمِّیِّ مُعْجِزَۃً فِی الْجَاھِلِیَّۃِ، وَالتَّادِیْبِ فِی الْیُتُمِ

(آپ کا یہی ایک معجزہ ایمان لانے کے لیے کافی ہے کہ آپ اُمی ہوتے ہوئے علم رکھتے تھے اور زمانہ جاہلیت میں جب کہ کوئی پڑھانے والا نہ تھا، آپ نے علم کا سکہ جمادیا، اور جب کہ والد بزرگوار کا سایہ موجود نہ تھا جو آپ کی تربیت کرتے لیکن اس کے باوجود تربیت یافتہ ہونے کا ثبوت دیا۔)

امی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب، آپ کی صفت اور نبوت کی دلیل ہے کہ بغیر کسی کے سکھائے ہوئے ایک لفظ بھی کسی سے پڑھا نہیں، اور پڑھاتا بھی کون؟ جزیرۂ عرب میں اس عہد کے لوگ سب کے سب ناخواندہ تھے مگر آپ کی زبانِ مبارک سے علم کے سوتے پھوٹے، آسمان و زمین اور آفاق و انفس کے سربستہ راز سے آپ نے لوگوں کو مطلع کیا، ناخواندہ ہونا، یا اس حالت پر باقی رہنا جو پیدائش کے وقت تھی دوسرے انسانوں کے لیے عیب کی بات ہے، مگر یہی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اعزاز و فخر کی بات ہے کیونکہ یہ آپ کے صادق ہونے کا ثبوت ہے۔[1]

---

[1] اُمّی کے معنی ناخواندہ کے ہیں، قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ آیا ہے: ھُوَالَّذِیْ بَعَثَ (باقی اگلے صفحہ پر)

خَدَمْتُہٗ بِمَدِیْحٍ اَسْتَقِیْلُ بِہٖ ذُنُوْبَ عُمْرٍ مَضٰی فِی الشِّعْرِ وَالْخِدَمِ

اِذْ قَلَّدَانِیْ مَاتُخْشٰی عَوَاقِبُہٗ کَاَنَّنِیْ بِھِمَا ھَدْیٌ مِنَ النَّعَمِ

(میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک قصیدہ نعتیہ کے ذریعہ خدمت کی، جس کے واسطے سے میں اپنی عمر کے سارے گناہوں کی معافی کا امیدوار ہوں جو شعر خوانی اور لوگوں کی خدمت گزاری میں بسر کی ہے۔ اس شعر خوانی اور لوگوں کی خدمت خوشامد نے میری گردن میں ایسا قلادہ ڈال دیا جس کے انجام کار کا خوف تھا اور ان قلادوں کو پہن کر ایسا لگتا ہوں جیسے ہدی کا جانور ہو۔)

پہلے شعر میں حضرت بوصیریؒ یہ بتارہے ہیں کہ میرے اعمال سب خراب ہیں، سراپا معصیت ہوں، پوری زندگی لوگوں کی خوشامد میں اور ان کی قصیدہ خوانی کرتے اور ان کی خواہشات جاہ و منزلت کو پورا کرنے میں بسر کردی ہے، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرکے میں چاہتا ہوں کہ اپنی پر معصیت زندگی کا کفارہ ادا کروں۔

أستقیل بہ کا مطلب ہے طلب اقالۃ، پابندیوں سے آزاد کرنے کی طلب، اسی طرح گناہوں کی آلودگیوں سے پاک کرنے کی طلب کو بھی 'استقالۃ" کہتے ہیں، اس شعر کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے سیرت نگار نبوی علامہ شبلی نعمانیؒ کے اس بند سے مدد لیجیے:

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا (اللہ وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ایک رسول بھیجا، بعض فضولی قسم کے لوگوں نے کہا کہ اُمّی (ناخواندہ ہونا کوئی خوبی کی بات نہیں ہے بلکہ یہ عیب ہے اور مقامِ مدح میں اس کا ذکر کیوں کر درست ہوسکتا ہے لہٰذا اس کو ام القریٰ (مکہ مکرمہ) سے منسوب کہا جائے، یعنی ام القریٰ کے رہنے والے، اس کو راغب اصفہانی نے بھی نقل کیا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ وہم ہے، مگر اس دور کے بعض "محققین" نے اس کو بڑے شد و مد سے بیان کیا ہے، اور اس کا غلط ہونا اس طرح ثابت ہے کہ صرف ام القریٰ کا باشندہ ہونا کوئی فضیلت نہیں رکھتا ورنہ آپ کے تمام دشمن ابوجہل، ابولہب سب یہیں کے باشندے تھے مگر ان کے لیے یہ بات قابلِ امتیاز نہیں ہوئی۔ امتیاز کا سبب کوئی انوکھی، عجوبہ بات ہوتی ہے۔

(عمن)

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ھدی من النعم کا مطلب یہ ہے کہ حج کو جانے والے قربانی کے جانور لے جایا کرتے تھے تو اس پر ایک زخم کا نشان لگا دیتے جس سے لوگوں کو معلوم ہوتا کہ قربانی کے لیے یہ جانور مخصوص ہیں اس کی وجہ سے لوگ حملہ آور نہیں ہوتے تھے۔ حضرت بوصیریؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سے پہلے میں نے جن کی خوشامد میں تعریف کی انھوں نے اس کا انعام بھی دیا اور گردن میں طوق بھی ڈالا، مگر وہ طوقِ ظلمت و معصیت تھا جس کے انجام کار سے میں خوفزدہ ہوں اور میری حیثیت اس طوق کو گردن میں ڈالنے کے بعد ایک جانور کی سی رہی جو قربانی کے لائق سمجھا گیا، اور اب نعت نبوی کو اپنا موضوع بنا کر ان گناہوں کو دھونا چاہتا ہوں۔

اَطَعْتُ غَیَّ الصِّبَا فِی الْحَالَتَیْنِ وَمَا — حَصَلْتُ اِلَّا عَلَی الْآثَامِ وَالنَّدَمِ
فَیَا خَسَارَۃَ نَفْسٍ فِی تِجَارَتِھَا — لَمْ تَشْتَرِ الدِّیْنَ بِالدُّنْیَا وَلَمْ تَسُمِ
وَمَنْ یَبِعْ آجِلًا مِنْہُ بِعَاجِلِہٖ — یَبِنْ لَہُ الْغَبْنُ فِی بَیْعٍ وَفِی سَلَمِ

(۱۔ میں نے نوعمری کی بے راہ روی کی دونوں حالتوں میں پیروی کی اور اس کا مآل گناہوں کے بوجھ اور شرمندگی و ذلت کے سوا کچھ نہ نکلا۔)

"دونوں حالتوں" سے مراد غیروں کی مدح خوانی اور ان کی خدمت۔ جس کا اوپر کے شعر میں ذکر آیا ہے۔

(۲۔ کس درجہ گھاٹے اور خسارہ کا سودا ہے جو اس شخص نے اٹھایا جس نے دنیا کو تج دے کر دین کی دولت نہ حاصل کی اور نہ اس کا سودا کیا۔)

یعنی کبھی ہمت بھی نہیں ہوئی کہ دنیا کے بدلے میں آخرت کا سودا کرنے کی فکر کرے۔ تَسُوم سَامَ یسوم سے قیمت لگانا۔

(۳۔ اور جس نے یہ سودا کیا کہ دیر آمد (ثواب آخرت) کو متاع حاضر (دنیا) لے کر فروخت کر دیا، اس کو معلوم ہو جائے گا کہ خرید و فروخت میں اس نے کہاں دھوکہ کھایا۔)

ان تینوں اشعار کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ ہم نے اپنی عملی زندگی غیروں کی مدح خوانی اور خوشامد

(خدمت) میں گزاری تو سوائے حسرت و یاس اور گناہوں کے کچھ ہاتھ نہیں آیا، آہ میں نے کس درجہ خسارہ اور گھاٹے کا سودا کیا، دین بیچ کر دنیا خریدی، اور جو دیر آمد (آجل) کو متاع حاضر (عاجل) پر قربان کرتا ہے تو اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نے کس درجہ گھاٹے کا سودا کیا۔

وَاِنْ آتِ ذَنْبًا فَمَا عَھْدِیْ بِمُنْتَقِضٍ — مِنَ النَّبِیِّ وَلَا حَبْلِیْ بِمُنْصَرِمِ
فَاِنَّ لِیْ ذِمَّۃً مِنْہُ بِتَسْمِیَتِیْ — مُحَمَّدًا وَھُوَ اَوْفَی الْخَلْقِ بِالذِّمَمِ

(اگر مجھ سے معصیت سرزد ہوئی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو ایمان ہے اور جس کا ہم نے عہد کیا ہے اس پر حرف آگیا یا آپ سے تعلق کا رشتہ منقطع ہو گیا، کیوں کہ مجھے تو ایک عہد آپؐ کی طرف سے مل چکا ہے کہ میرا نام محمد رکھا گیا ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کائنات میں سب سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں۔)

اس دوسرے شعر کا پس منظر یہ ہے کہ شاعر جناب بوصیریؒ کا نام محمد ہے (ابو عبداللہ محمد بن سعید البوصیری) اور کسی کے نام کو اپنانا، یا اپنے فرزند کا نام رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو اس ذات سے تعلق و محبت ہے جس کا نام اس نے انتخاب کیا ہے، کبھی کوئی شخص کسی ناپسندیدہ انسان کا نام اختیار نہیں کرتا، لہٰذا محمد نام رکھنے کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ جس نے یہ نام رکھا اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انس و تعلق ہے، اور اپنے فرزند کے لیے وہ تمنا رکھتا ہے کہ وہ آپ کا مطیع و فرمانبردار ہو۔ مصنف کے کلام سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس نام کے رکھنے کی ترغیب دے رہے ہیں، شارح شیخ ابراہیم الباجوری لکھتے ہیں کہ: "اس بارے میں متعدد احادیث موجود ہیں، ایک روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن دو بندے اللہ کے حضور میں پیش ہوں گے اور ان کو جنت کی بشارت ملے گی، وہ اپنے اعمال کو دیکھتے ہوئے حیرت زدہ ہو کر پوچھیں گے کہ یا ربی! ہمارے اعمال تو ایسے نہیں تھے کہ ہم جنت کے سزاوار ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو گا کہ اے میرے بندو! تم کو جنت ہم نے بخش دی کیوں کہ ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ جس کا نام محمد یا احمد ہو گا اس کو دوزخ میں نہیں ڈالیں گے۔" اسی طرح کی متعدد احادیث شیخ ابراہیم الباجوریؒ نے اس شعر کی شرح کے ضمن میں نقل کی ہیں مگر کسی مجموعۂ

احادیث کا نام نہیں لیا ہے اور نہ یہ ذکر کیا ہے کہ یہ احادیث صحت وضعف کے لحاظ سے کس درجہ کی ہیں.

إِنْ لَمْ يَكُنْ فِي مَعَادِي آخِذاً بِيَدِي   فَضْلًا وَإِلَّا فَقُلْ يَا زَلَّةَ الْقَدَمِ

حَاشَاهُ أَنْ يُحْرِمَ الرَّاجِيْ مَكَارِمَهُ   أَوْ يَرْجِعَ الْجَارُ مِنْهُ غَيْرَ مُحْتَرَمِ

(اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کرم ونوازش سے میری دستگیری کرنے والے نہ بنے تو میری لغزش قدم کا عقاب بڑا ہی سخت ہوگا، لیکن وہ اس سے بہت بلند ہیں کہ اپنے امیدوار کو عطا وبخشش سے محروم رکھیں، یا کوئی ان کا سہارا لینے والا بے توقیر ہو.)

پہلے شعر کا الفاظ کے اعتبار سے یہ ترجمہ ہے کہ میری آخرت میں میری دستگری کرنے والے نہ ہوئے تو یہی کہو کہ ہائے رے میری لغزش قدم.

احادیث صحیحہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شفاعت کرنا اور آپ کو اذن شفاعت ملنا ثابت ہے اور صراحت کے ساتھ احادیث میں وارد ہے کہ انبیائے کرامؑ اس روز یہ فرمائیں گے کہ مجھے اپنی پڑی ہے نفسی نفسی کا محاورہ اردو میں اسی حدیث سے ماخوذ ہے جو صحاح کی تمام کتابوں میں مذکور ہے. گزشتہ اشعار میں شاعر قصیدہ حضرت بوصیریؒ اپنی بشری لغزشوں کا حوالہ دیتے ہوئے اور قیامت کی ہولناکی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ میرا رأس المال اللہ کی رحمت پر یقین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تمنا اور کاوش ہے. ان دو شعروں میں بھی وہ اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ بروز قیامت دستگیری کا سہارا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ہے، اور اللہ نے آپ کو جن معنوی اور ظاہری خصوصیات سے نوازا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم یہ وہم وگمان بھی نہیں کر سکتے کہ قیامت کے دن وہ اپنے امتیوں کو شفاعت سے محروم فرمائیں گے اور آپؐ کی ذات سے توقع قائم کرنے والا کبھی ذلیل وخوار ہوگا.

عربی داں حضرات کے لیے یہ اشارہ ضروری ہے کہ پہلے شعر میں (إلّا) زائد ہے اور حرف ندا اظہار تأسف کے لیے ہے جیسے عربی میں کہتے ہیں یا خیبة أملی (ہائے رے میری امیدوں کی ناکامی) اور یا سوء حظی.

شیخ ابراہیم باجوری نے اس کی شرح اس طرح لکھی ہے کہ جس دن ہم اللہ کے سامنے لوٹ کر جائیں گے اس وقت اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فضل وکرم سے میری دستگیری اپنی شفاعت سے فرمائیں گے تو کہنا کہ قدم جم گیا، اور اگر ایسا نہیں ہوا تو کہنا ہائے رے میری لغزش قدم، یہ شرح الفاظ اور مفہوم کو منطبق

رکھنے کی کوشش ہے.

وَمُنْذُ أَلْزَمْتُ أَفْكَارِي مَدَائِحَهُ   وَجَدْتُهُ لِخَلَاصِي خَيْرَ مُلْتَزَمِ

وَلَنْ يَفُوتَ الْغِنَى مِنْهُ يَداً تَرِبَتْ   إِنَّ الْحَيَا يُنْبِتُ الْأَزْهَارَ فِي الْأُكُمِ

(جب سے میں نے افکار کو نعت نبوی لکھنے پر پابند کیا تو مصائب سے نکلنے کے لیے اس کو بہت بہترین پناہ گاہ پایا، دنیا کی بہبود سے وہ ہاتھ محروم نہیں رہ سکتا جو خیر کا طالب ہو کر اٹھائے، بارش پھولوں کو پہاڑیوں پر اگا دیتی ہے.)

ان دونوں شعروں میں مداح رسول کریمؐ شیخ بوصیریؒ فرماتے ہیں کہ جب سے نعت گوئی کو ہم نے اپنا مشغلہ بنایا دنیا کی مصیبتیں دور ہوگئیں، اور دنیا کی بہبودی کا طالب بھی آپ کے در سے خالی ہاتھ نہیں جاتا جب تیز بارش ہوتی ہے تو صرف سطح زمین پھول پودے نہیں اگاتی بلکہ کوہستان پر بھی سبزہ اگنے لگتا ہے، لہٰذا اگر اعمال کے لحاظ سے ہمارا وجود پہاڑی پتھروں کی طرح سخت اور ناقابل روئیدگی ہے جب بھی بارش کی کثرت اس کو فیضان سے محروم نہیں رکھے گی جیسا کہ معلوم ہے کہ اس قصیدہ کے ناظم حضرت بوصیری کے جسم پر فالج گر گیا تھا، انھوں نے جب یہ قصیدہ لکھا تو خواب میں دیدار نبوی سے مشرف اور بردہ مبارکہ سے سرفراز ہوئے جس سے ان کا مرض جاتا رہا، (ملاحظہ ہو تفصیل قسط اول)

پہلے شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ میں نے جب سے نعت خوانی شروع کی میری مصیبتیں دور ہوگئیں.

ان دونوں شعروں میں بعض الفاظ کی تشریح عربی داں اور غیر عربی داں دونوں حضرات کے لیے ضروری ہے، مدائح، جمع مدیحة کی ہے، بعض لوگ غلطی سے مدیح کی جمع سمجھتے ہیں.* ملتزم، کے معنی وہ جگہ جس سے اگر کوئی چمٹ جائے اور مانگے، تَرِبت کے معنی ہیں دریوزہ گر ہونا، مانگنا، حاجت مند ہونا، اس لیے کہ تراب مٹی کو کہتے ہیں. ترب کے معنی خاک آلودہ ہوا اور یہ تذلل اور افتقار کی علامت ہے، حَیَا کے معنی ہیں بارش، بشرطیکہ اس کو مد اور ہمزہ کے ساتھ نہ پڑھا جائے، اُکم، اکمة کی جمع ہے جن کے معنی پہاڑی، پتھریلی زمین کے ہوتے ہیں. یہ لفظ پہلے بھی آچکا ہے.

* کیوں کہ فعیل کی جمع فعائل نہیں آتی

وَلَمْ أُرِدْ زَهْرَةَ الدُّنْيَا الَّتِي اقْتَطَفَتْ يَدَا زُهَيْرٍ بِمَا أَثْنَى عَلَى هَرِمِ

(اور میں نے نعت خوانی کے ذریعہ دنیا کے پھل پھول نہیں طلب کیے جنھیں ہرم بن سنان کی مدح کر کے زہیر کے ہاتھوں نے توڑے ہیں۔)

اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ زہیر بن ابی سلمیٰ کا ممدوح ہرم بن سنان المری تھا جو عرب کا ایک مشہور سخی شہزادہ تھا، زہیر نے اس کی مدح میں کہا:

قِفْ بِالدِّيَارِ الَّتِي لَمْ يَعْفُهَا الْقِدَمُ بَلَى وَغَيَّرَهَا الْأَرْوَاحُ وَالدِّيَمُ
إِنَّ الْبَخِيلَ مَلُومٌ حَيْثُ كَانَ وَلٰـ ـكِنَّ الْجَوَادَ عَلَى عِلَّاتِهِ هَرِمُ
هُوَ الْجَوَادُ الَّذِي يُعْطِيكَ نَائِلَهُ عَفْوًا وَيُظْلَمُ أَحْيَانًا فَيَنْظَلِمُ
وَإِنْ أَتَاهُ خَلِيلٌ يَوْمَ مَسْغَبَةٍ يَقُولُ لَا غَائِبٌ مَالِي وَلَا حَرِمُ

(ذرا اس بستی کے در و دیوار کو دیکھو جن کو "کہنگی" (پرانا ہونا) مٹا نہ سکی، ہاں یہ ضرور ہے کہ بارشوں اور ہواؤں نے ان کا حلیہ بدل دیا ہے، بخیل مستحق ملامت ہے جہاں بھی رہے، لیکن سخی جس کو کہا جائے وہ اپنی کمزوریوں کے باوجود ہرم ہی ہے، ہرم وہ سخی داتا ہے جو اپنی جود و سخا سے تم کو بے طلب دیتا ہے اور جب اس پر زیادتی کی جاتی ہے تو زیادتی برداشت کر لیتا ہے، اگر فاقہ و تنگی کے وقت کوئی دوست آتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میری دولت نہ کم ہوئی ہے اور نہ ناپید ہوئی ہے۔)

حضرت بوصیریؒ نے اپنے شعر میں زہیر کے اسی قصیدہ خوانی کا ذکر کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا مطمح نظر اگرچہ دنیاوی دولت نہیں ہے جس طرح زہیر کی تھی پھر بھی مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بابِ رحمت سے صحت و بہبود سب ہی ملا۔

اس شعر پر ایک اردو کی رباعی یاد آگئی جو ضلع اناؤ کے ایک دوست نے کبھی سنائی تھی جو دراصل حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی منقبت میں کسی نے کہا تھا:

مدح خوانی کے عوض لعل نہ گوہر لیں گے جس میں تسنیم چھلک جائے وہ ساغر لیں گے
اشک پٹکا کے غم سبط نبیؐ میں دو چار آنکھیں اس بات پہ مچلی ہیں کہ کوثر لیں گے
يَا أَكْرَمَ الْخَلْقِ مَالِي مَنْ أَلُوذُ بِهِ سِوَاكَ عِنْدَ حُلُولِ الْحَادِثِ الْعَمِمِ

(اے خلق میں سب سے زیادہ برگزیدہ پیغمبر! آپ کے سوا کون ہے کہ عمومی اور ہمہ گیر مصیبت کے نازل ہونے کے وقت اس کی پناہ حاصل کر سکوں۔)

اس شعر کا مفہوم قصیدہ بردہ کے شارح شیخ ابراہیم الباجوری کے نزدیک یہ ہے کہ شاعر آخرت میں میدان حشر کا تصور کر رہا ہے اور اس عالم کو یاد کر رہا ہے جب کہ بڑے بڑے پیغمبران اولوالعزم نفسی نفسی کہتے ہوں گے اور کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوگی۔ اس وقت ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو اذن شفاعت مرحمت ہوگا اور آپ سجدہ ریز ہو کر بارگاہ الٰہی میں التجا فرمائیں گے، اے اللہ! ان سب کو بخش دے، اس منظر کو شاعر اپنی نگاہوں میں رکھ کر کہہ رہا ہے کہ قیامت کے روز میری یہی فریاد ہوگی کہ یا اکرم الخلق الخ

اگر شعر کا یہی مفہوم ذہن میں رکھا جائے تو نہ یہ شرک ہے اور نہ غیر اللہ سے سوال و التجا، مگر عام طور سے "خوش عقیدہ" حضرات اس کا یہ مفہوم لیتے ہیں کہ شاعر کی مراد دنیاوی مصائب سے نجات طلب کرنا ہے اور وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نجات طلب کر رہا ہے، اور یہ مفہوم صراحۃً بغیر اشارہ و کنایہ کے شرک ہے، جس کی وجہ سے بہت علماء و مشائخ نے اس پورے قصیدہ کو ناپسند کیا ہے، لیکن صحیح مفہوم وہی ہے جو پہلے نقل کیا گیا، کیونکہ شاعر نے الحادث العمم کہا ہے، یعنی ایسی مصیبت جو سب کے لیے یکساں طور پر سخت ہوگی اور یہ قیامت ہی کا روز ہو سکتا ہے، عربی زبان میں اور خاص طور پر قرآن مجید میں غائب کو بیان کرتے ہوئے حاضر کی طرف ملتفت ہو جانا مستقبل میں جو بات پیش آنے والی ہے یا جو مکالمہ ہوگا اس کو ماضی کے صیغہ میں کہنا اور مستقبل میں جو فریاد کرنی ہے اس کو اس طرح بیان کرنا گویا آج کہہ رہے ہیں بہت عام ہے اور اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔

وَلَنْ يَضِيقَ رَسُولَ اللّٰهِ جَاهُكَ بِي إِذِ الْكَرِيمُ تَحَلَّى بِاسْمِ مُنْتَقِمِ
فَإِنَّ مِنْ جُودِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتَهَا وَمِنْ عُلُومِكَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

(یا رسول اللہ! آپ کی وجاہت اس روز میرے لیے تنگ نہ ہوگی جب کہ رب کریم کے نام 'منتقم' کی تجلی ہوگی یا جس روز رب کریم اپنے نام 'منتقم' کی صفت کو ظاہر کرے گا، کیوں کہ آپ کی سخاوت کا دائرہ دنیا و آخرت دونوں میں پھیلا ہوا ہے اور لوح و قلم کا علم آپ کے علوم میں داخل ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ شاعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر عرض کرے گا کہ یا رسول اللہ!

آج اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے اسم منتقم کی تجلی کا دن ہے، اس روز گناہگار جہنم کے خوف سے کانپ رہے ہیں، لرز رہے ہیں کیوں کہ اللہ کی صفت منتقم کی تجلی کا وقت ہے اس وقت آپؐ کو جو اللہ تعالیٰ کے حضور قدر ومنزلت اور شرف تقرب حاصل ہے اس کا دائرہ ہرگز اتنا تنگ نہیں ہے جو مجھ جیسے گناہگار کو اپنے آغوشِ شفاعت میں نہ لے سکے، اور آپ سخی ہیں اور آپ کی سخاوت کے حدود صرف دنیا تک نہیں ہیں بلکہ دنیا کے مقابل آخرت میں بھی وہ ظاہر ہوں گے اور جہاں تک میرے گناہوں کا تعلق ہے وہ اپنی زبان سے کیا کہوں، آپ خود جانتے ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو علم آپ کو عطا فرمایا ہے اس میں لوح وقلم کے علوم بھی داخل ہیں۔

ان دونوں شعروں پر متعدد اعتراضات کیے گئے ہیں۔ ایک اعتراض تو یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان الفاظ میں اور ایسے طرز میں فریاد کی گئی ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، مگر اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روز قیامت میں پیش آنے والے مکالمے کی محاکات ہے، اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت برحق ہے، اور یہ بھی برحق ہے کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت طلب کریں گے، دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ حادث نہیں قدیم ہیں، تو یہ کہنا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنی صفت انتقامیہ میں ظاہر ہوگا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی کریمی کی صفت معدوم ہو جائے گی یا اگر معدوم نہیں بھی ہے تو ایک صفت انتقامی باقی رہ جائے گی۔ یہ بھی غلط ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت ان مسائل میں امام ابوالحسن الاشعریؒ کے اصول پر یہ مانتے ہیں کہ کریم اور منتقم دونوں فعلی صفتیں ہیں اور اشاعرہ کے نزدیک صفات فعلیہ حادث ہیں، لہذا اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ شاعر نے اللہ تعالیٰ کی صفت کریمی اور صفت انتقام دونوں کو ایک جگہ ذکر کیا ہے جب کہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، اس کا جواب بھی یہی ہے کہ صفت کریمی تو دائمی، ابدی اور سرمدی ہے اور صفت انتقام فعلی اور طاری ہے لہذا دونوں میں تضاد نہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں تحلیٰ آیا ہے جس کے معنی ہیں آراستہ ہونا، اس کا لفظی ترجمہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جس روز اپنی صفت منتقمانہ سے آراستہ ہوگا، یا یوں کہیے کہ جس روز اللہ تعالیٰ کی یہ صفت مشاہدہ میں آئے گی، کیونکہ دنیا میں صرف صفت کریمی ورحیمی کا مشاہدہ ہوا ہے، دوسری شکل یہ ہے کہ تحلیٰ کے بجائے تجلیٰ (جیم) سے پڑھا جائے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس روز اسم منتقم کی تجلی ہوگی۔

شیخ الباجوری کہتے ہیں کہ روایت کے لحاظ سے تحلیٰ (ح کے ساتھ) صحیح ہے مگر درایت کے لحاظ سے تجلیٰ (جیم سے) زیادہ قرین قیاس اور صورت حال کے زیادہ مطابق ہے۔

دوسرے شعر میں اس مفہوم کو ظاہر کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے امتی دونوں جگہ یعنی دنیا وآخرت میں وابستہ ہیں، دنیا میں ہدایت اور آخرت میں شفاعت صرف آپ کی ذات کے لیے خاص ہے، دنیاوی زندگی میں جس طرح پچھلے انبیاء کی لائی ہوئی شریعتیں منسوخ ہو چکیں اور سرچشمۂ ہدایت رہتی دنیا تک کے لیے حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات باقی رہیں گی اور کوئی ہدایت قابل قبول نہیں ہے سوائے اس ہدایت کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیا کو ملی ہے، بعینہ یہی حالت آخرت میں پیش آئے گی کہ کوئی پیغمبر کسی ایک کی شفاعت کا بھی سزاوار نہیں ہوگا، صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذنِ شفاعت ملے گا، اس سلسلے میں متعدد ومتنوع احادیث نبویہ موجود ہیں۔

آخر میں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شفاعت کا طالب ہر شخص ہوگا، ہر ایک کی تمنا ہوگی کہ رحمۃ للعالمین کے سایۂ رحمت میں اس دن کھڑا ہو جس روز کوئی اور سایہ نہ ہوگا (یوم لاظل الاظلہ) لیکن جن کے نامۂ اعمال خود روشن ہیں یا وہ السابقون الاولون میں ہیں یا اصحاب الیمین میں ان کا شمار ہے ان کو شفاعت کی ضرورت نہیں ہوگی، مستحق شفاعت تو گناہگار ہوں گے، خواجہ حافظ بھی کہہ گئے ہیں:

نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو　　　که مستحق کرامت گناہ گارانند

اور مرحوم جگر مراد آبادی نے دوسرے انداز میں اس مفہوم کو بیان کیا ہے:

رحمت ہوگی طالب عصیاں　　　رشک کرے گی پاکیٔ داماں

لیکن یہ سب شعر وشاعری کی باتیں ہیں، حقیقت یہ ہے کہ لباس بشریت میں آنے کے بعد کوئی متنفس ایسا نہ ہوگا جس کو رحمت خداوندی اور شفاعت مصطفوی کی ضرورت نہ ہو۔ دنیا کی مثال کوئلہ کی کان سمجھیے، اس کان کے اندر جانے کے بعد آپ کا جسم اور لباس خواہ کسی پتھر سے مس نہ ہو اور پورے احتیاط کے ساتھ آپ باہر نکل آئیں جب بھی وہاں کی ہوا آپ کے جسم ولباس پر اثر انداز ہو ہی جائے گی۔ غالب نے اس فلسفہ کو بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے:

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی　　　میں، ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

انبیاء کرامؑ اور صالحین کی مناجاتیں پڑھیے، ان کے تذکرہ ابتہال، کرب وگریہ کے قصے پڑھیے، راتوں کو محراب مسجد میں کھڑے ہو کر بید لرزاں کی طرح ان کا کانپنا اور تڑپنا، آنسوؤں سے وضو کرنا اور استغفار کرتے رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے ہر شخص اپنے نقص اور لغزش سے ڈرا اور سہما ہوا ہے اور جس کو جتنا زیادہ علم ہے اسی درجہ زیادہ خوف آخرت رکھتا ہے اسی لیے فرمایا گیا ہے، "اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا" یعنی اللہ سے اس کے وہ بندے ڈرتے ہیں جن کو علم حاصل ہو"۔ لہٰذا شفاعت کی ضرورت اور رحمت کی طلب اور لغزشوں سے مغفرت کی تمنا ہر ایک کو ہوگی۔

یَانَفْسُ لَاتَقْنَطِی مِنْ زَلَّۃٍ عَظُمَتْ ۔۔۔ اِنَّ الْکَبَائِرَ فِی الْغُفْرَانِ کَاللَّمَمِ
لَعَلَّ رَحْمَۃَ رَبِّیْ حِیْنَ یَقْسِمُھَا ۔۔۔ تَأْتِیْ عَلٰی حَسَبِ الْعِصْیَانِ فِی الْقِسَمِ

(اے نفس! تو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، خواہ معصیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو کیوں کہ گناہِ کبیرہ کی حیثیت بخشش کے معاملہ میں معمولی لغزشوں کی ہے۔ یقین ہے کہ میرے رب کی رحمت جب تقسیم ہوگی تو معصیت کے بقدر ہر گناہگار کا حصہ ہوگا۔)

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ بخشنے اور رحم کرنے پر آئیں تو اس کی رحمت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے اور بقول سعدی کے:

عزازیل گوید نصیب برم

گناہ کبیرہ بے شک پناہ مانگنے کی چیز ہے اور اس کی سزا سخت ہے لیکن اللہ کے دریائے رحمت کے سامنے بڑے بڑے گناہوں کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی اور یہ دیکھا گیا ہے کہ جو زیادہ مصیبت زدہ، پریشان حال اور بے سہارا ہوتا ہے اس کو مدد اتنی پہنچائی جاتی ہے جو اس کی ضرورت کا تکفل کرے، اسی طرح بڑے گناہگار کو رحمت ومغفرت کا بڑا حصہ ہمیں ملے گا کیوں کہ ہم بڑے گناہگار ہیں۔

یَارَبِّ وَاجْعَلْ رَجَائِیْ غَیْرَ مُنْعَکِسٍ ۔۔۔ لَدَیْکَ وَاجْعَلْ حِسَابِیْ غَیْرَ مُنْخَرِمٍ
وَالْطُفْ بِعَبْدِکَ فِی الدَّارَیْنِ اِنَّ لَہٗ ۔۔۔ صَبْرًا مَتٰی تَدْعُہُ الْاَھْوَالُ یَنْھَزِمٖ

(اے میرے رب! میری آس نہ ٹوٹے اور میری توقعات کا رشتہ منقطع نہ ہو، اور اے مالک! اپنے بندے پر دونوں جہان میں مہربان رہ، کیوں کہ اس کی طاقت صبر وشکیبائی مصائب کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔)

ایک حدیث قدسی ہے کہ: "انا عند ظن عبدی بی" کہ ہم اپنے بندے کی امید کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں، اور ایک دعائے ماثورہ کے الفاظ ہیں: اللھم قد انقطع الرجاء الا الیک وخابت الآمال الا فیک، یعنی اے میرے معبود! میرا رشتۂ امید ہر ایک سے کٹ چکا ہے سوائے تیری ذات کے، اور میری توقعات دنیا میں ناکام رہیں سوائے اس توقع کے جو تیری ذات سے قائم ہے۔

حضرت بوصیریؒ نے اپنے نعتیہ قصیدے کے اختتام میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طرف اپنی امیدوں اور توقعات کا رُخ موڑا اور یہ ثابت کردیا کہ ان کے عقیدہ میں کوئی جھول، یا مسلک توحید میں کوئی خراش نہیں ہے۔ ایک بشر جب اپنی معصیت کو دیکھتا ہے تو اس پر مایوسی طاری ہوتی ہے اور جب اللہ کی رحمتِ بے پایاں پر نظر ڈالتا ہے تو اس کے اندر امید کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور یہی امید وبیم کی کشمکش مرنے تک قائم رہتی ہے جو ایمان کی علامت ہے، حدیث سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ مومن کا قلب خوف و رجاء کے درمیان رہتا ہے۔

قاعدہ ہے کہ حمد وثناء کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلاۃ وسلام بھیجا جاتا ہے اور اس قصیدہ کا موضوع ہی نعت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہے لہٰذا حضرت بوصیریؒ نے اپنے قصیدہ کا اختتام صلاۃ وسلام کے ان دو شعروں پر کیا ہے۔

وَأْذَنْ لِسُحْبٍ صَلَاۃٍ مِنْکَ دَائِمَۃً ۔۔۔ عَلَی النَّبِیِّ بِمُنْھَلٍّ وَمُنْسَجِمٍ
مَا رَنَّحَتْ عَذَبَاتُ الْبَانِ رِیْحُ صَبًا ۔۔۔ وَأَطْرَبَ الْعِیْسَ حَادِی الْعِیْسِ بِالنَّغَمِ

(اے اللہ! اپنی رحمتوں کے بادلوں کو حکم دے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر موسلا دھار اور مسلسل مینھ برساتے رہیں، اور جب تک بان کی شاخیں نسیم صبا سے جھومتی رہیں اور جب تک حدی خوانوں کے نغمے اونٹوں کو مستانہ وار چلاتے رہیں۔)

عربی شاعری کا اسلوب ہے کہ ہمیشگی اور دائمی طور پر کسی چیز کے قائم رہنے کے لیے یا ہمیشگی کی دعا دینے کے لیے کہا کرتے ہیں کہ جب تک چاند سورج نکلتا رہے، جب تک زمین، زمین اور آسمان، آسمان رہے، جب تک سانس لینے والے سانس لیتے رہیں، اردو میں طول مدت کے لیے کہا کرتے ہیں اللہ رہتی دنیا تک قائم رکھے، یا غالب نے جس طرح کہا ہے:

تم سلامت رہو ہزار برس ۔۔۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یا جس طرح انیسؔ نے کہا ہے:

جب تک کہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

اسی طرح حضرت بوصیریؒ نے فرمایا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلاۃ وسلام کی بارش اس وقت تک ہوتی رہے جب تک کہ نسیم صبا سے لہلہاتے ہوئے پودے جھومتے رہیں اور حدی خوانوں کے نغمے اونٹ کو مست کرتے رہیں، یعنی ہمیشہ ہمیشہ۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ نسیم صبا کے متعلق عربوں کا خیال ہے کہ صبا اس جھونکے کو کہتے ہیں جو درِ کعبہ سے اٹھتا ہے، اور حدی خوانی اور اونٹ خاص جزیرہ عرب کی چیز ہے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں ان کا حوالہ قابلِ لحاظ بلاغت رکھتا ہے۔

قصیدہ بردہ کے (۱۶۰) اشعار ہیں جن کا ترجمہ کسی درجہ تشریح کے ساتھ کیا گیا، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور حضرت بوصیریؒ اور ان کے شارحین کو جزائے خیر دے، اس قصیدہ کے متعلق جو کچھ تنقیدی انداز میں کہا گیا ہے اس کی اچھی توجیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ "مداحِ ممدوحِ خدا" سے کسی کو بدگمانی نہ ہو اور خواہ جو بھی کہا جائے، مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں یہ قصیدہ مقبول ہے اور یقیناً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک نے اس کو پسند کیا ہے۔

الحمدللہ کہ اس قصیدہ کے آخری بیس شعر مکہ مکرمہ میں جمعہ کے دن بعد نماز عصر بتاریخ ۲۶ صفر ۱۴۰۹ھ مطابق ۷ اکتوبر ۱۹۸۸ء مکمل ہوئے۔ ان آخری صفحات کی نقل عزیز گرامی مولوی اختر نسیم ندوی کے حصہ میں آئی، اللہ تعالیٰ ان کو اور ہم کو اور اس کے پڑھنے والوں کو اجر و رحمت سے سرفراز فرمائے۔

فقیر و عاجز و بے نوا

عبد اللہ بن عباس غفر اللہ لہما

www.facebook.com/Naat.Research.Centre
www.sabih-rehmani.com/books